LOK VIRSA PUBLISHING HOUSE

لوک ورثہ اشاعت گھر

چترال کی لوک کہانیاں

چترال کی لوک کہانیاں

غلام عمر

لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد

چترال کی لوک کہانیاں

پہلی اشاعت ——— جنوری ۱۹۸۴ء

دوسری اشاعت ——— اپریل ۱۹۸۷ء

نگران : عکسی مفتی

ایڈیٹر : مظہر الاسلام

سرورق تصاویر : عکسی مفتی

سرورق ڈیزائن : مظہر الاسلام

مصنف : غلام عمر

کتابت : محمد شفیع چیمہ

تعاون : انجمن ترقی کھوار، چترال

لوک ورثہ اشاعت گھر، پوسٹ بکس ۱۱۸۴ - اسلام آباد۔

شعبۂ مطبوعات ۔ قیمت : ۷۰ روپے

ترتیب

چترال پاکستان کا دُور افتادہ اور دشوار گُذار علاقہ ہے۔ اور وادیٔ چترال چاروں طرف
سے اُونچے اُونچے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ جو سال کے بیشتر وقت برف سے ڈھکے رہتے ھیں
سڑک کے ذریعے چترال تک پہنچنا اُن دروں کے راستے ممکن ہے جو ان پہاڑوں میں جگہ جگہ
واقع ہیں۔ مگر کئی درے بھی برف کی وجہ سے سال کا بیشتر وقت بند رہتے ہیں۔ ہوائی جہاز کی
پرواز بھی موسم پر منحصر ہے۔

چترال لوک گیتوں، کہانیوں اور سیاحوں کا علاقہ ہے۔ اور اس کا روائتی ورثہ صدیوں پر
پھیلا ہوا ہے۔ لوک ورثے کے قومی ادارے نے چترال کے لوک ورثہ کے باضابطہ اندراج اور اُسے
محفوظ کرنے اور آگے بڑھانے کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام شروع کر رکھا ہے۔ جس کے تحت
لوک گیتوں، کہانیوں اور زبانی روایات کو ٹیپ اور سلائیڈوں اور فلم پر محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ
کتابی صورت میں بھی شائع کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے لوک ورثہ کے قومی ادارے کی ایک ٹیم نے
چترال کے دورے کے دوران وہاں کے ادیبوں، لوک ورثہ پر تحقیق کرنے والوں اور انجمن ترقی کھوار
کے اراکین سے ملاقات کی اور انہیں چترال کے لوک ورثہ پر تحقیق کرنے کی دعوت دی۔ یہ کتاب اس سلسلے

کی ایک کڑی ہے اور ہم انجمن ترقی کھوار کے تعاون کے ممنون ہیں۔اس کتاب میں جو کہانیاں شامل کی گئی ہیں
شاید اس سے پہلے اس طرح کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ان کہانیوں میں ایک فطری سچائی ہے
اور ان کا مزاج چترال کی وادی کے خودرو پودوں اور چشموں سے ملتا جلتا ہے۔یہ کہانیاں چترال کی دلکش
سرزمین کا سچا عکس ہیں اور ان میں صدیوں کی لوک روایات سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ان کہانیوں
کی فطرت سے ہم آہنگی دراصل چترال کے رہنے والے لوگوں کی زندگی کا عکس بھی ہے۔چترال کے باسی ابھی
مصنوعی تہذیب و تمدن سے آلودہ نہیں ہوئے۔اسی لئے ان کے دل کی دھڑکنوں میں نہ تفاوت ہے اور
نہ تضاد۔اسی سادگی اسی سچائی کی جھلک آپ کو ان کہانیوں میں ملے گی ؎

ہاشم بیگم

سرزمین چترال کے سینے میں ہزاروں راز دفن ہیں یہ سرزمین بڑے بڑے جابر بادشاہوں کو اُن کے غرور سمیت اپنی خاک میں دفن کر چکی ہے۔ کئی بار اس زمین نے اپنے سینے پر بسنے والے گھروں کو اُجڑتے اور بستے دیکھا ہے۔ غیر ملکی حملہ آوروں کا بھی گزر ہوا۔ سکندر کی فوجیں بھی اِس کے سینے کو روندتی ہوئی گزر گئیں۔ اس نے ان طاقتوں کو بھی دیکھا جو آج صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکی ہیں۔ مگر حکمرانِ گوبس کی اس حسین شہزادی کی قبر کو نہ مٹا سکی جو آج بھی اس کے سینے پر موجود ہے۔ یہ قبر بوسیدہ ہے مگر زندہ ہے اور اسے ہاشم بیگم کی قبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو "دینن" کے مقام پر واقع "شہادوک" میں اب بھی ایک داستان کو اپنے پہلو میں لئے خاموش پڑی ہے۔

ہاشم بیگم گوبس کے حکمران کی اکلوتی بیٹی تھی۔ شاہانہ طور طریقے سے اس کی پرورش ہوئی۔ زندگی کا

آرام اسے میسر تھا۔ نازو نعم میں پل کر جب اس نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کے حسن کے ساتھ اس کی سیرت کے چرچے دور دور تک ہونے لگے۔ بڑے بڑے خوب صورت اور وجیہہ نوجوان امیر زادے اسے اپنانے کے خواہشمند تھے۔ یہ شہرت وادیٔ چترال تک جا پہنچی۔ اور چترال کے حکمران نے شاہ گوپس کو اپنے بیٹے کا پیغام بھجوایا۔ شاہِ گوپس نے اسے اپنی بیٹی کے لئے مناسب سمجھا۔ شاہِ چترال کا بیٹا گوپس آرہا تھا اور شاہ گوپس اس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگا۔

سات روز سے محل خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ شاہ گوپس آنے والے مہمانوں کے شاندار استقبال کی تیاریوں بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔ شاہی مہمان خانے کو سجانے میں ہر شخص مصروف تھا۔ آنے والے مہمانوں میں چترالی شہزادے کے ہمراہ چند وزراء، خواتین اور پچاس جوانوں پر مشتمل اس کے خصوصی باڈی گارڈ بھی آرہے تھے۔ ان کے لئے الگ الگ کمروں کا انتظام اور مہمانوں کے گھوڑوں کے لئے الگ الگ اصطبل تیار کئے جانے لگے۔ حکمران گوپس کے وزراء اور دیگر شریکِ انتظامیہ مہمانوں کے ٹھہرنے اور خاطر مدارات میں پوری طرح مگن تھے۔ محل گوپس کو انتہائی شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا۔ مہمانوں کا یہ قافلہ چترال سے گوپس آرہا تھا کیونکہ خان رئیس نے اپنے بیٹے کے لئے حکمران گوپس کی صاحبزادی کا رشتہ مانگا تھا یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بارات آرہی تھی جسے شاہِ گوپس کی شہزادی ہاشم بیگم کو چترال اس کے سسرال لے جانا تھا۔ تیاریاں مکمل ہوگئیں اور اب مہمانوں کی آمد کا انتظار تھا۔ حکمران گوپس کا خصوصی باڈی گارڈ کا دستہ بھی چاق و چوبند انداز میں تیار تھا تاکہ مہمانوں کی آمد کے موقع پر اپنے فن کا مظاہرہ کر سکے اسلحہ خانے سے انہیں خصوصی قسم کی تلواریں دی گئی تھیں۔ شاہی محل کے بیرونی گیٹ پر خوب صورت لباسوں میں مسلح سنتری کھڑے کئے گئے تھے۔ اسی اثنا میں دور سے ایک سوار ان کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔ سوار تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ پہنچ گیا اور شاہی محل کے سامنے

آکر رکا۔ یہ حکمران گوپس کا خصوصی محافظ شمشیر شاہ تھا جو مہمانوں کی آمد کی اطلاع حکمران کو پہنچانے پر مامور تھا۔ سنتریوں نے فوراً دروازے کھول دیئے اور کچھ دیر بعد ہی پچاس سواروں کا ایک دستہ انتہائی زرق برق لباس میں استقبال کے لئے باہر نکلا۔ اس دستے میں وزراء بھی شامل تھے جن میں بختور بیگ نمایاں تھے جو حکمران گوپس کا مشیر اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور انہیں ساتھ لانے کے لئے جا رہے تھے۔

حکمران گوپس کی صاحبزادی شہزادی ہاشم بیگم جونہی اپنے خوب صورت کمرے سے باہر نکلی تو کنیزوں کی ایک ٹولی اس کی منتظر تھی۔ اس نے کمرے کے برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی جو محل کے بیرونی حصے کو سجانے میں مصروفِ کار تھے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چبوترے سے نیچے اتر کر ایک کیاری کے پاس کھڑی ہو گئی جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے وہ اس کیاری کی حفاظت بھی خود ہی کیا کرتی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کلیوں پر انگلیاں پھیریں۔ اس وقت بادِ حشمٹ چل رہی تھی اور چاروں طرف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شہزادی نے ایک پھول توڑ لیا اور ایک نظر کنیزوں پر ڈال کر مسکرائی اور وہ پھول اپنے سامنے کھڑی ہوئی صحیفہ کی زلفوں میں لگا دیا۔ صحیفہ جو اس کی خالہ زاد بہن تھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ پھول تو قدرت نے آپ کی زلفوں کے لئے بنائے ہیں صحیفہ ایک خوبرو شیریں کلام لڑکی تھی۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ دونوں ہم عمر بھی تھیں اور ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتی تھیں۔ صحیفہ شہزادی کو آج اچھے موڈ میں دیکھ کر بہت خوش تھی کیونکہ وہ شہزادی کی طبیعت میں ایک ہفتے سے عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ شہزادی ایک شوخ طبع لڑکی تھی۔ شوخی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ ہر وقت کنیزوں کو مختلف انداز میں ستانے کے علاوہ صحیفہ کو بھی نشانہ بنایا کرتی تھی۔ ہر وقت فقرے چست کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا جبکہ ایک ہفتے سے اس کی شوخیاں بجھ سی گئی تھیں اور ایک گہری سنجیدگی اس میں پیدا ہو چکی

تھی۔ہنسی کی کوئی بات بھی ہوتی تو وہ صرف مسکرا دیتی۔وہ صحیفہ کے ساتھ میں ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چل دی کنیزیں تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔

"شہزادی کے رویے میں یہ تبدیلی کیسی ہے"۔ایک کنیز نے سوالیہ نظروں سے دوسری کنیز سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ چہرالی شہزادہ زیادہ سنجیدہ ہو"۔دوسری کنیز نے جواب دیا۔

"لیکن یہ دن تو مسکرانے کے ہوتے ہیں"۔

"مسکرانے کے نہیں قہقہوں کے"۔تیسری کنیز درمیان میں بول پڑی۔

"ہو سکتا ہے آنے والی نئی زندگی کے لئے خود کو پہلے سے تیار کر رہی ہو"۔

شہزادی ہاشم اور صحیفہ دونوں کمرے میں بیٹھی تھیں۔صحیفہ شہزادی کی بدلتی ہوئی حالت کے متعلق سوچ رہی تھی۔وہ شہزادی سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر زبان خاموش تھی۔دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔کیونکہ اب نہ وہ قہقہے،نہ ہر بات میں تبسم ریزیاں،نہ ہی بے فکریاں اور نہ ہی عشرت سامانیاں۔صحیفہ سے زیادہ دیر ضبط نہ ہوا۔اور اُٹھ کر شہزادی کے گلے میں باہیں ڈالتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"شہزادی آپ کے دشمنوں کی طبیعت ہمیشہ خراب ہو۔میں آپ کو چند دنوں سے کھوئی کھوئی دیکھ رہی ہوں"۔

ہاشم بیگم اس کے اس سوال پر مسکرائی۔پھر اس کی زلفوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی جواب دیا۔"نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں"۔

"تو کیا میری نظریں دھوکا کھا رہی ہیں"۔صحیفہ نے پوچھا۔

"شاید"۔شہزادی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے بہن نہیں سمجھتی ہو"صحیفہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔"

تم تو اُس دل ہی میں بس رہی ہو"۔ شہزادی نے جواب دیا۔ اور اپنی طرف کھینچ کر اُس کے رخساروں پر چٹکی لی۔

"تو پھر اپنی پریشانی چھپاتی کیوں ہو۔"

"مجھے تو کسی قسم کی بھی پریشانی نہیں ہے"۔ شہزادی نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ صحیفہ اُس کی زبان سے یہ بات سُن کر تھوڑی دیر خاموش رہی پھر اپنے آپ کو جدا کرتی ہوئی کہا

صبح تمہاری قسمت کا فیصلہ شہزادہ کوہستان سے ہونے والا ہے اور اگر اس طرح چپ چاپ رہیں تو اچھا نہیں ہوگا ملکہ خالہ سے میں نے سُنا ہے کہ شہزادے کے ہمراہ شہزادی بلقیس اور آٹھ کنیزیں بھی ہیں وہ تمہیں ملیں گی تو کیا تاثر لیں گی۔ ہاں یہ بھی سن چکی ہوں کہ کوہستانی شہزادہ بہت خوب صورت اور بہادر جوان ہے اور اپنے علاقے میں بہت مقبول شخصیت ہے۔ اس کے علاوہ ملکہ سے باتوں باتوں میں یہ بھی سن چکی ہوں کہ خان رئیس کا یہ اکلوتا بیٹا ہے جو تختِ شاہی کا وارث ہے"۔ صحیفہ نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ کر شہزادی کی طرف دیکھا۔

"تم اچھی تقریر کر سکتی ہو یہ کس نے سکھائی ہے" شہزادی نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری صحبت نے سکھا دیا ہے"۔ صحیفہ نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ پھر شہزادی سے شکایت بھرے لہجے میں بولی۔ آخر تم بجھی بجھی سی کیوں ہو۔ اور مجھے بھی بتانا نہیں چاہتی"۔ یہ بات سن کر کچھ دیر خاموش سوچتی رہی۔

"صحیفہ تم میری بہن بھی ہو اور میری رازدان بھی بخدا میں نے کبھی کوئی بات تم سے چھپائی ہو۔ چند دنوں سے میرا دل گھبرا رہا ہے کیوں۔ یہ میں بھی نہیں جانتی۔ سوچتی ہوں کہ میں نے گلستان میں آنکھ کھولی اب کسی صحرا میں بھٹک نہ جاؤں۔ کوہستان اور وہاں کے لوگوں کے متعلق میں بہت سی اچھی اچھی باتیں سن چکی ہوں لیکن سنی سنائی باتوں پہ یقین نہیں آتا۔ کیونکہ میری قسمت کا فیصلہ جس شہزادے کے حق میں ہو رہا ہے اُس کو میں جانتی تک نہیں۔

اور ان محلوں کے راز اور خاندانی معاملات تو اس میں رہنے والے ہی خوب جانتے ہیں جو تم سے پوشیدہ نہیں۔ کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ میرے ہاتھ سینکڑوں میل دور ایک بیگانے ہاتھ میں دیے جا رہے ہیں معلوم نہیں وہاں خوشیاں میرا انتظار کر رہی ہیں یا بدبختیاں۔ میں اس حسین خطے کو ہی نہیں تمہیں بھی چھوڑ کر جا رہی ہوں جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ جہاں محبت ہے نفرت نہیں، چاہت ہے بیگانگی نہیں۔ وہاں کے آداب، تہذیب و تمدن مجھے راس بھی آتی ہے مجھے اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور عزیزوں کو چھوڑ کر دور بہت دور جانا تو پڑے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میری شادی اتنی دور ہوگی۔ شہزادی انتہائی کرب کے ساتھ کہہ رہی تھی اور صحیفہ خاموش سنتی رہی۔

مہمانوں کا قافلہ پہنچ چکا تھا۔ شاہی محل میں مہمانوں کے آرام کے لئے سینکڑوں ملازمین دست بستہ کھڑے تھے۔ خواتین کے لئے دربارِ خاص میں رہنے کا انتظام کیا گیا تھا اور مہمان شہزادہ جس کے لئے شاہی مہمان خانے کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اپنے وزراء کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ جس کی نظر بھی دولہا شہزادے پر پڑی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور شہزادی ہاشم کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ ادھر مہمان خواتین اپنی پرائی تمام زرق برق لباس زیبِ تن کئے شہزادی کی ایک جھلک کے لئے بے چین تھیں۔

دستور کے مطابق ہر آنے والی رشتہ دار قیمتی قیمتی تحفے ساتھ لائی تھی۔ ملکہ گوہر نے ایک کنیز کو اشارہ کیا اور کنیز دوڑتی ہوئی شہزادی کے کمرے میں گئی جہاں صحیفہ بھی اس کے ساتھ تھی کنیز نے ملکہ کا بلاوا دیا۔ شہزادی نہایت نفیس جوڑے اور نایاب زیورات سے آراستہ تھی۔ اس وقت وہ حسن کی دیوی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر صحیفہ نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

چلو شہزادی! ملکہ منتظر ہوں گی۔

"مجھے ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ارے! شرم کی کیا بات ہے تمہیں دیکھ کر سب دنگ رہ جائیں گے ماشاء اللہ آج تم کوئی حور لگ رہی ہو" صحیفہ نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں اُٹھ کر دربار کی طرف چلنے لگیں اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ صحیفہ آگے آگے تھی۔ دونوں پری جمال لڑکیاں ایک ساتھ دربار میں داخل ہوئیں اور ایک ساتھ شرمیلے انداز میں سلام کیا۔ سوائے ملکہ کے تمام خواتین انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سب سے پہلے شہزادی بلقیس نے آگے بڑھ کر شہزادی کو گلے لگایا اور پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر شہزادی نے صحیفہ کو گلے لگایا اور باقی مہمان خواتین نے بڑھ کر آداب کیا۔

شہزادی ہاشم صحیفہ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ صحیفہ اسے شہزادے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اُس نے آج شہزادے کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شہزادی کا اشتیاق بڑھا۔ اور دل ہی دل میں اُسے ایک نظر دیکھنے کے لئے منصوبے بنانے لگی۔ صحیفہ نے اُسے کہا کہ وہ کسی نہ کسی بہانے اسے شہزادے کو دکھا دے گی۔

اچانک باہر سے لوگوں کی آواز سنائی دی۔ صحیفہ اور شہزادی دونوں جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگیں۔ باہر شاہ گوپس اور شہزادہ جیرال کھڑے تھے۔ شاہ ہاتھ کے اشارے سے شہزادی کو اپنے پاس بلایا۔ سفید بدخشی نسل کے گھوڑے پر سوار مہمان شہزادہ سوار تھا۔ شہزادی نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ میری آرزوں کا مالک ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس دھڑکن میں مسرتیں بھی تھیں، خوشیاں بھی۔ اُس نے شہزادے کا پُر وقار چہرہ بھی دیکھ لیا جو چاند کی طرح حسین تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، مضبوط جسم اور شریفانہ انداز نے ایک وقار پیدا کیا ہوا تھا اس نے شہزادے پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی کہ سواروں کا قافلہ بڑے دروازے کی طرف جاتے لگا شاید گوپس کے خوب صورت مقامات اور دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے

سیر کو جا رہے تھے۔ ایک جھلک میں ہی شہزادی دُور خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ اس کا نازک دل گل لالہ اور نرگس کے پھول جیسے جھومنے لگا۔ خوب صورت دلفریب معصوم چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھِل اُٹھا تھا۔ اس کے دل میں ہزاروں اُمنگیں اور آرزوئیں ایک ساتھ انگڑائیاں لینے لگیں۔ مہمان شہزادہ اس کے معصوم دل میں بس چکا تھا۔ صحیفہ کافی دیر تک اس کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر چھیڑتے ہوئے بولی۔

شہزادہ بڑا ظالم ہے جو میری پیاری خو نزہ کو اس حالت میں چھوڑ گیا۔ آخر میری شہزادی کس دنیا کی سیر کر رہی ہے"۔ شہزادی ہاشم نے کوئی جواب نہ دیا۔ شرم سے نظریں جھکالیں۔

صحیفہ نے اس کی شرمیلی ادا پر اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر بولی۔

"عشق کوسوں دُور گیا اور حسن یہاں محوِ حیرت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مہمان شہزادہ دل بھی ساتھ لے گیا ہے۔ بخدا شہزادے کی آنکھیں بھی خود گوپس کو دیکھنے کے لئے ترس رہی ہوں گی"۔

صحیفہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ شہزادی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ہنس پڑیں۔

وقت گزرتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ مہمانوں کا آج آٹھواں دن تھا۔ اس دوران شہزادی کئی بار اپنے ارمانوں کے شہزادے کو چوری چھپے دیکھ چکی تھی۔ مہمان شہزادہ محل کے ہر مرد و زن کے دل پر چھا گیا تھا۔ حکمران گوپس نے اپنی بیٹی کے سفر کے سارے انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ رسم نکاح کوہستان میں خان رئیس کے محل میں ہونا قرار پائی تھی۔ کوہستانی دستور کے مطابق سسرال میں جاکر ہوتی تھی اور خان رئیس نے تختِ شاہی کے وارث کا اعلان بھی اس موقعے پر کرنا تھا۔

حکمرانِ گلگت نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے بیٹی کی رسمِ نکاح کو چترال میں ہونے کا اعلان کر دیا۔ گو انہ گلگت نے خان رئیس کے اس پیغام کو آدابِ شاہی کے منافی قرار دیا۔ مگر حکم شاہی صادر ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے حکمران گوپس کے فیصلے پر اعتراض نہ کیا گیا اور چلنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ اور انتہائی قیمتی سامان سونے چاندی کے کثیر تعداد میں زیورات

بیٹی کے جہیز میں دے دیئے گئے۔"پونیال" کا سارا علاقہ بھی اس کو دے دیا گیا۔ زرق برق قیمتی پوشاکوں کے انبار لگا دیئے گئے۔ بیس خوبرو کنیزیں بھی شہزادی کے حصے میں آئیں جو بعد میں خان رئیس حکمران چترال نے اپنے وفادار نمک خواروں میں تقسیم کر دیں۔

شاہی محل سے باہر ہزاروں لوگ جمع تھے جو اپنے محبوب حکمران کی بیٹی ہاشم بیگم کو رخصت کرنے کے لئے صبح سے محل کی طرف آ رہے تھے۔ سب کی نظریں محل کے بیرونی دروازے پر مرکوز تھیں سورج نکل چکا تھا۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں اور پھولوں کی خوشبو چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ نیلے آسمان پہ بادل کے آوارہ ٹکڑے سفید کبوتروں کی طرح فضا میں رقص کر رہے تھے۔ لوگوں کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ شاہی محل کا دروازہ کھلا اور سواروں کا ایک دستہ باہر نکلا۔ جو حکمران گلگت کے امراء اور شہزادوں پر مشتمل تھا۔ ان کے پیچھے خان رئیس، مہمان شہزادہ اور اس کے خصوصی باڈی گارڈ کے دستے تھے۔ آخری دستہ خواتین کا تھا جن میں شہزادی ہاشم اور شہزادی بلقیس کے گھوڑے خصوصی طور پہ سجائے دکھائی دے رہے تھے۔ شہزادی ہاشم کے ہمراہ بیس کنیزیں بھی تھیں اور ایک شخص خواتین کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہ سینگ نامی تھا جو شہزادی ہاشم کا شیرتت تھا۔ باہر کھڑے لوگوں نے بلند آواز میں مبارک باد کے نعرے لگائے اور ڈھول دمال کی آوازیں فضا میں پھیل گئی تھیں۔ بانسریوں کی سریلی آوازیں بھی کانوں کو چھو رہی تھیں۔ ہر طرف سے پھولوں کی بارش تھی۔ براتیوں کا یہ جلوس نہایت شان و شوکت سے گزر گیا۔ بارات بہت دور نکل گئی مگر لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے شہر سے نکل کر بارات والے رک گئے۔ حکمران گوپس اور اس کے امراء الوداع کہہ کر واپس لوٹ آئے۔ حکمران گوپس کی آنکھوں میں بیٹی کی جدائی کے آنسو تھے۔ یہی حال شہزادی کا تھا جو اپنے شفیق باپ سے رخصت ہو چکی تھی۔ آنسوؤں کا ایک طوفان اس کی آنکھوں سے امڈ رہا تھا۔ شاہی بارات اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جنہیں پندرہ سولہ دن کی

مسافت طے کرنا تھی۔ قافلے کے سردار کرم رئیس نے چار سواروں کو باراتیوں سے پہلے چترال روانہ کر دیا جن کے ذمے اطلاع دینا اور انتظامات کی تیاری کرنا تھی۔ کرم رئیس نے ایک دوسرا پیغام بھی ملکہ رئیس کو بھیجا جو انتہائی رازداری کے ساتھ دیا جانا تھا۔

شہزادی ہاشم کی بارات چودہ دن کی طویل مسافت کے بعد خان رئیس کے محل سے صرف ایک کوس کے فاصلے پر رک گئی جہاں خواتین کے لئے خصوصی خیمے نصب کئے گئے اور مردوں کے لئے الگ انتظامات ہوئے۔ باڈی گارڈ نے اپنے فرائضِ منصبی سنبھال لئے۔ شہزادے کے لئے بھی دوسرے خیموں سے ہٹ کر الگ خیمہ لگایا۔ سبھی اپنے اپنے خیموں میں تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں طویل سفر سے تھکے مسافروں کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مگر شہزادی ہاشم جاگ رہی تھی۔ آج نہ جانے کیوں نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اندھیری رات تھی، چاند مشرقی سمت پر فلک بوس پہاڑوں کی اوٹ سے نکلنے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا مکمل چہرہ پہاڑوں کی اوٹ سے باہر نکلا اور ستاروں کے جھرمٹ میں مسکرانے لگا۔ کبھی کبھی جب بدلیوں کی اوٹ میں چھپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لئے کائنات پر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ شہزادی کی آنکھوں میں نیند کا نام تک نہ تھا۔ وہ چاند کے سینے میں ایک داغ دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی سامنے پہاڑیوں سے گیدڑ کی آواز آتی اور اس کی ڈراؤنی آواز اس کے کانوں کو چھوتے ہوئے گزر جاتی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور چاند اپنی منزل کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگی۔ بادِ صبا کے لطیف جھونکے چلنے لگے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو اڑنے لگی۔ ہواؤں میں ہلکی ٹھنڈک تھی۔ اسی اثناء میں ایک چیخ سنائی دی۔ ہلکی سی آواز تھی جیسے کسی کا گلا دبا دیا گیا ہو۔ یہ آواز کچھ دور خیموں کی طرف سے آئی تھی۔ شہزادی نے دوبارہ سننے کی کوشش کی مگر سوائے گھوڑوں کے ٹاپوں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ٹاپوں کی یہ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئی۔ شہزادی کا دل گھبرایا اور وہ آہستہ آہستہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے

خیمے سے باہر نکل گئی اور ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کہیں بھی کوئی غیر معمولی چیز نظر نہ آئی اور وہ سہمے سہمے قدم اٹھاتی ہوئی دوبارہ خیمے میں آگئی۔ نہ جانے اس کا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ وہ بستر پہ لیٹ گئی نیند جو رات بھر اس سے دور رہی تھی اب آنکھوں پہ دباؤ ڈالنے لگی تھی اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی جو کلمۂ حق کہتے ہوئے خیمے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ یہ آواز سینگ کی تھی جو شہزادی کا (شیر تت) تھا۔ آہستہ آہستہ خواتین جاگنے لگیں اور سامنے سڑک پہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ شہزادی اور دوسری خواتین نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا۔ سواروں کا ایک قافلہ تھا جس میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ شہزادی بلقیس نے ہاشم بیگم کو بتایا کہ یہ استقبالی قافلہ ہے جو محل رئیس کی طرف سے آیا ہے۔ آنے والے سب ایک ہی مقام پہ آکر ٹھہر گئے۔ بارات کو بھی سفر کی تیاری کے لئے کہا گیا۔ شہزادی اپنے ساتھیوں سمیت دوبارہ خیمے میں چلی گئی اور ناشتہ کرنے لگ گئیں۔ ناشتے کے بعد شہزادی ہاشم اور بلقیس اور دوسری خواتین بھی تیار ہونے میں مصروف ہو گئیں۔ یوں تو شہزادی کا خداداد حسن اس کا محتاج نہیں۔ وہ مکمل تیاری کے بعد خیمہ سے باہر نکل رہی تھیں کہ اتنے میں استقبالی خواتین قریب آگئیں۔ ان میں بیگم خان رئیس کے علاوہ امرائے دربار کی بیگمات اور کنیزوں کی ایک بڑی جماعت بھی تھی جو رنگ برنگ کپڑے پہنے ہوئے تھیں جو چترال کے تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے تھے۔ شہزادی ان ڈھیلے ڈھالے فراخ کپڑوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوئی۔ ملکہ رئیس سب سے پہلے شہزادی کے خیمے میں داخل ہوئی ان کے پیچھے پیچھے دوسری خواتین بھی۔ ملکہ رئیس کو دیکھتے ہی شہزادی بلقیس آگے بڑھی اور سلام کیا۔ اس کے بعد شہزادی ہاشم نے آدابِ شاہی کے مطابق آداب کیا اور ملکہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ملکہ نے بھی اس کی سفید پیشانی کو چوم لیا۔ باری باری سبھی استقبالی خواتین دربارہ شہزادی ہاشم اور شہزادی بلقیس سے بغلگیر ہوئیں گرم گرم ہونٹوں کی لمس شہزادیوں کو چھونے لگیں۔ خیمہ چھوٹا تھا۔ اس وجہ سے سب کو باہر نکلنا پڑا۔ باری باری بیگمات امرا کا تعارف کرانے لگیں کنیزوں نے بھی ایک ساتھ سلام کیا شہزادی نے بھی جواب میں شکریہ

ادا کیا۔ باراتی قافلے کا سردار کرم رئیس بھی وہاں آیا اور انہیں سفر کی تیاری کا حکم دیا گیا۔

استقبالی مرد سواروں کا قافلہ ہراول دستے کے طور پر سب سے آگے چلنے لگا۔ درمیان میں خواتین کے گھوڑے تھے۔ان کے آخر میں باراتی قافلے کے سوار تھے۔ یہ قافلہ محل رئیس کی طرف روانہ ہوا۔ ڈھول ڈھامہ بجنے لگے۔ قافلے کے آگے کئی جوان پیدل ناچتے جارہے تھے اور گانے والوں کی ایک ٹیم تھی جو آپ نے روایتی انداز میں گیت گا رہے تھے جو عام طور پر شادی بیاہ کے موقعوں پہ گائے جاتے ہیں۔ بانسری کی سریلی آواز دلوں کو لبھا رہی تھی۔ صرف شہزادی ہاشم کی شرمیلی نگاہیں کسی ایک ذات کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ جوں جوں منزل قریب آرہی تھی شہزادی کی ان جانی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ دل میں کتنے ہی وسوسے جنم لینے لگے اس کی بیتاب نظریں ہر گھوڑے پر پڑیں مگر کہیں بھی بدخشی نسل کا وہ سفید گھوڑا نظر نہ آیا جس پہ اس کا مہمان شہزادہ سوار تھا اور چودہ دن کی مسافت اس کے ہمراہ طے کی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنے ساتھ والے گھوڑے پہ سوار شہزادی بلقیس سے پوچھنے کی کوشش بھی کرتی۔ مگر ہر بار شرم و حیا درمیان میں حائل ہو جاتی تھی اور زبان گنگ ہو کر رہ جاتی۔ وہ سکون اور بے سکونی کی منزل سے گزر رہی تھی۔ کائنات کا مزاج اس کو بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ فضا اداس اداس سی تھی۔ قافلہ انتہائی شان و شوکت سے اپنی منزل پہ رواں دواں تھا۔ شہزادی ہاشم کے دل میں امید کی اگر کوئی کرن تھی تو صرف یہی تھی کہ سارے باراتیوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے جو کسی حادثے کی صورت میں ایسے ہرگز نہ ہوتے۔ اس نے سوچا کہ شاید کوہستان کا دستور یہ ہو کہ دولہا باراتیوں کے ہمراہ نہ آتا ہو۔ یا پہلے ہی وہ محل چلا گیا ہو۔

خان رئیس کے محل کو انتہائی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ صبح ہی سے دستور وطن کے مطابق استقبالیوں کا ہجوم محل میں جمع ہو رہا تھا۔ مرد مردوں کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور خواتین آپس میں مل کر صلاح مشورے کر رہی تھیں اور راستے میں ہی باراتیوں سے ملنے کے لئے تیاریاں کرنے

ئیس محل کے بیرونی باغ میں رنگ برنگی قالین بچھائے گئے تھے جہاں مہمانوں کو کھانا کھلانے کا انتظام تھا۔ باراتی مہمان مردوں کے لئے اندرونی باغ میں انتظام کیا گیا تھا۔ بیرونی باغ صرف رعایا مہمانوں کے لئے تھا۔

خواتین اپنے محبوب حکمران کی اس خوشی پر ایک دوسرے سے اپنی خدمت میں سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ باغبانوں نے رنگ برنگے خوشبودار پھولوں کو چن کر ہار بنائے اور مختلف قسم کے پھل چن کر پلیٹوں میں سجا دیئے۔

خان رئیس جو اپنے چند وزراء کے ساتھ باغ کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر بعد بولا۔

" حکمران گوپس کا یہ فیصلہ کہ شہزادی کی شادی شہزادہ کہوستان سے قبول کرتا ہوں ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہوا۔"

" اللہ کو یہ منظور ہوگا اور ان دونوں کا ستارہ ازل سے ملا ہوگا۔" ایک مشیر نے خان رئیس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

" حکمران گوپس کو جو پیغام ہم نے بھیجا تھا اس میں ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔"

" وہ کیا؟"

" وہ یہ کہ ہمیں اس بات کا ذکر نہ کرنا چاہیئے تھا کہ شہزادی کی رسم نکاح اور شہزادے کو وارث تخت منتخب کرنے کا اعلان ایک ساتھ کریں گے۔"

واقعی یہ ہماری سخت غلطی تھی۔ شاہ گوپس شہزادے کو نہیں جانتا کہ وہ ایک گنوار شخص ہے۔

خان رئیس اس بات پر پریشان تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

خان رئیس اپنے نالائق گنوار بیٹے کی شادی حکمرانِ گوپس کی خوبرو اور ذہین شہزادی ہاشم سے کرنے پر رضامند نہ تھے بلکہ ملکہ رئیس نے اس کو یہ رشتہ مانگنے پر مجبور کر دیا تھا خان کو یقین تھا کہ حکمران گوپس کوئی معقول بہانہ بنا کر انکار کر دے گا۔ اس سلسلے میں رئیس حکمران نے وفد کے سربراہ کو ہدایت بھی کی تھی کہ وہ شہزادے کے بارے میں کوئی بات چھپا کر نہ رکھے مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ملکہ نے اس معاملے میں ایک گہری چال چلی ہے اور حکمرانِ گلگت کو اپنی سازش کا نشانہ بنایا ہے۔ گنوار شہزادے کو وہ برائے نام وارث بنانے کا اعلان خان رئیس اس لئے چاہتے تھے کہ میرے دوسرے رشتہ داروں کی ہوس کم ہو جن کی نظریں تختِ شاہی پر لگی تھیں۔

ہاشم شہزادی کی بارات جب محل رئیس کے قریب پہنچی تو شام کے اُداس سائے چھائے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد و زن محل کے قریب جمع تھے۔ خان رئیس بھی اپنے اُمرائے دربار کے ہمراہ گھوڑے پر سوار تھا۔ کرم رئیس جو قافلے کا سردار تھا فوراً گھوڑے سے نیچے اترا اور ایک فاتح مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے خان رئیس کو سلام کیا۔ خان اور دوسرے امراء بھی گھوڑے سے اُترے۔ کرم رئیس آگے بڑھ کر خان کے ہاتھوں کو چوما سب سے خوش آمدید کہا باراتیوں میں سے تمام مرد سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اترے۔ خواتین گھوڑوں کے ساتھ شاہی دروازے سے اندر چلی گئیں۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ باراتی خواتین محل کے اندرونی باغ کے سامنے جا کر رک گئیں اور گھوڑوں سے نیچے اتریں محل کی چند خواتین کی مدد سے شہزادی بھی اتر آئی انہیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جو ملکہ کی خوابگاہ تھا۔ کمرہ انتہائی خوبصورت تھا۔ فرش کے مختلف حصوں پر چیتے اور ہرن کی کھالوں سے بنائے ہوئے خوب آرام دہ گدے بچھے ہوئے تھے ملکہ رئیس، شہزادی بلقیس اور شہزادی ہاشم کو سب سے پہلے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن شریف پیش کیا گیا۔ سبھی نے اٹھ کر انتہائی عقیدت سے چوما پھر اپنی اپنی جگہوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔ ملکہ رئیس

دانشیری) کے طور پر کھانا لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور پر تکلف کھانا کھانے لگیں۔ شہزادی ہاشم کو ہلکا بخار تھا اس نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور شہزادی بلقیس کے پوچھنے پر بتایا کہ اسے حرارت ہو گئی ہے۔ ملکہ اور بلقیس کھاتی رہیں۔ پھر ایک کنیز دسترخوان اٹھا کر لے گئی۔

"تمہیں تو سخت بخار چڑھا ہے ملکہ کچھ سہمے ہوئے انداز میں بولی"۔

ہاں "نانی "جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے"۔ ہاشم نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم آرام کرو میں طبیب بلاتی ہوں" ملکہ نے ایک کنیز سے طبیب کے متعلق کہا کنیز فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی شہزادی بلقیس ہاشم بیگم کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی جو ہاشم بیگم کے لئے مخصوص کیا گیا تھا شہزادی ہاشم کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شاہی طبیب آیا جو ستر اسی برس کا شخص تھا اس عمر میں بھی اس کا چہرہ تر و تازہ تھا طبیب اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا شہزادی ہاشم نے فوراً بستر سے اُٹھ کر سلام کیا طبیب نے شہزادی کو بیٹھنے کو کہا اور خود اس کی نرم و نازک کلائی پر ہاتھ رکھا۔ آپ کو تھکن کے سبب بخار ہو گیا ہے۔ دوا پی کر آپ آرام کریں۔ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہزادی کی طبیعت کی ناسازی کا سن کر خان رئیس بھی تشریف لائے شہزادی نے اس کو دیکھتے ہی فوراً اُٹھ کر سلام کیا خان رئیس نے شہزادی کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شفقت سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر خان رئیس اس کے پاس بیٹھے۔ حکمران گلگت اور ملکہ گوپس کے علاوہ طویل مسافت کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر خان رئیس چلے گئے۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہزادی ہاشم کی ناساز طبیعت کی وجہ سے رسم نکاح کا پروگرام ہاشم کی صحت یابی تک ملتوی کر دیا گیا۔ شہزادی ہاشم کے لئے دوا لائی گئی اور وہ آرام دہ بستر پر لیٹ گئی۔ شہزادی بلقیس بھی اس کے ساتھ کمرے میں تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں شہزادیوں کے مابین گفت گو ہوتی رہی۔ اس دوران کئی بار شہزادی ہاشم نے شہزادے کے متعلق

پوچھنے کی کوشش کی مگر ہر بار شرم و حیا درمیان میں حائل ہوئی اور باتیں کہتے کرتے بلقیس نیند کی آغوش میں چلی گئی مگر ہاشم جاگ رہی تھی نیند آنکھوں سے دور تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ شہزادے کی غیر موجودگی ایک خیال بن کر اس کی خوشی کو تفکرات کے اندھیروں میں گم کر رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی۔ عجیب عجیب خیالات اُس کو ڈس رہے تھے۔ وہ جتنا بھی سوچتی اتنی ہی اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔ پھر سونے کی کوشش کی اور کافی دیر بعد نیند کی وادی میں جا پہنچی۔

اندھیری رات تھی محل رئیس کے باغ میں کنیز صفورہ ایک عورت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ عورت گونگے شہزادے کی دائی اماں تھی اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے کیونکہ دن کو ملکہ رئیس نے اُسے یہ خبر دی تھی کہ اس کا بیٹا انتقال کر گیا ہے اور اس کو حکمران گوپس نے اپنے شاہی قبرستان میں دفن کر دیا ہے۔ کنیز صفورہ نے اس سے پوچھا کہ اس کے ڈیل ڈول اور خدوخال کیا تھے جانے کیوں اسے شک ہوا کیونکہ سفر کے دوران اور گلگت میں کوئی فوت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس بات کو گہرائی تک لے جانا چاہتی تھی۔

"بیٹی میرا لعل صرف بائیس سال کا کڑیل جوان تھا لمبا قد، سفید خوب صورت چہرہ۔ بھورے بال۔ لاکھوں میں ایک تھا۔ اور یہی اکیلا میرا سہارا تھا۔ باپ کا سایہ بچپن سے اُٹھ گیا تھا جب پیدا ہوا تو اسی دن خان رئیس کو بھی خدا نے لڑکا عطا فرمایا اور ملکہ رئیس نے مجھے ایک ہفتہ بعد محل میں بلا کر شہزادے کے لئے ماما کا فرض سونپا۔ اور محل میں ہی مجھے ایک کمرہ بھی دے دیا۔ میرا شوہر بھی میرے ساتھ رہتا تھا۔ وہ محل رئیس میں دربان تھا۔ بچپن سے ہی شہزادہ گونگا تھا۔ سب کی رائے تھی کہ یہ پیدائشی آسیب زدہ ہے۔ یہ دونوں دو سال تک میرا دودھ پیتے رہے اور اس کے بعد میری ذمہ داری ختم ہوئی اور دوبارہ گھر لوٹ آئی جو محل رئیس سے زیادہ دور نہیں تھا جب میرے بیٹے کی عمر دس برس ہوئی تو میرا شوہر ہمیں اکیلا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا اُس کے مرنے کے بعد بھی اس کی تنخواہ غلے کی صورت میں ہمیں ملتی رہی۔ اور یہ خان رئیس کی ہم پیر

مہربانی تھی جب میرا بیٹا پندرہ سال کا ہوا تو خان رئیس نے اُسے اپنے باڈی گارڈ میں شامل کر لیا۔ وہ انتہائی خوش اسلوبی سے اپنی خدمات ادا کرتا رہا۔ اور جب وہ بائیس سال کا نوجوان بنا تو ایک اعلیٰ تیر انداز ثابت ہوا۔ وہ نہایت خوب صورت جوان تھا۔ بڑی بڑی بارعب آنکھیں، سفید رنگ، بڑی پیشانی طویل قد و قامت، سنہری بال۔ وہ ایک ماہر شہسوار تھا غرض مردانہ حُسن کا ایک شاہکار تھا۔ بوڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کنیز کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

"کیا اس کے خال پہ ایک خوب صورت تل بھی تھا" صفورا نے پوچھا۔

"ہاں —— ہاں ——" کیا تم نے اسے دیکھا تھا صفورا خاموش ہو گئی کچھ دیر بعد بوڑھی بولی۔

ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھی تھی کہ محل سے ایک عورت آئی اور کہا کہ ملکہ نے طلب کیا ہے جب میں ملکہ کے پاس گئی تو وہ اکیلی بیٹھی تھی میں سلام کر کے اس کے کمرے میں گئی۔

ملکہ نے اس سے کہا کہ گلگت جانے والی بارات میں تمہارا بیٹا بھی شامل ہو گا کیونکہ میں اپنی بہو شہزادی کے لیے بہت قیمتی قیمتی زیورات بھیج رہی ہوں اور میں یہ سامان کرم رئیس کے حوالے بھی کر چکی ہوں جو وفد کا سردار ہے۔ مگر مجھے اس پر مکمل اعتماد نہیں۔ وہ لالچی آدمی ہے اور دوم یہ کہ وہ ایک جذباتی قسم کا آدمی ہے کہیں کسی مقام پہ جذبات کا مظاہرہ کرے گا جو خدانخواستہ شہزادے کی شادی کے معاملے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ چونکہ تمہارا بیٹا ایک ذہین ہونہار ہے۔ وہ ایسے موقعوں پہ اس کو سمجھائے گا۔ اور نہ زیورات کے معاملے پہ بھی کڑی نظر رکھے گا۔ اس نے یہ ہدایت بھی کی کہ تمہارے بیٹے کا وفد کے ساتھ گوپس جانے کا راز کسی کو بھی معلوم نہ ہونا چاہیئے۔ بڑھیا جو ابھی تک کنیز سے باتیں کر رہی تھی دوپٹے سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ مجھے کیا معلوم کہ موت گوپس میں میرے بیٹے کا انتظار کر رہی ہے۔ میں خوش تھی کہ میرے لعل کو باراتی ہونے کا شرف حاصل ہو گا۔ مجھے علم نہ تھا کہ شاہی جوڑے کی یہ بارات

بجائے خوشیوں کے اپنے ہمراہ میرے بیٹے کی موت کی منحوس خبر لائے گی۔ بوڑھی عورت یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔ کنیز صفورا جو ابھی تک اُس کی داستانِ غم سُن رہی تھی بولی :-

"اماں تم خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا۔ وہ گوپس سے صحیح سلامت واپس آیا ہے۔ مَیں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تمہارے بیٹے کو شہزادہ بنا کر محل گوپس لایا گیا تھا۔ وہ دُولہا شہزادے کے روپ میں آیا تھا۔ یہ ایک سازش تھی، گہری سازش۔ اس سازش میں دو ہاتھ ہیں مجھے اس سازش کا علم ہو چکا ہے۔ یہ ملکہ رئیس اور کرم رئیس کے درمیان ہوئی ہے۔ خان رئیس بھی اس سازش میں شامل نہیں۔ تمہارا بیٹا گلگت سے لے کر چترال تک ہمارے ساتھ تھا۔ صرف آج ایک کوس کے بعد کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کو اغوا کیا گیا ہے تاکہ شہزادی کا نکاح اس گونگے شہزادے سے کیا جا سکے۔ ملکہ نے شہزادی ہی کو نہیں بلکہ حکمرانِ گلگت کو بھی دھوکا دیا ہے اماں رات کافی گزر چکی ہے۔ اب تم جاؤ۔ مَیں آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ تمہارا بیٹا زندہ ہے۔

"اللہ سے دُعا کر۔ وہ بڑا مہربان ہے اور میری شہزادی کے لئے بھی دُعا کر کہ اللہ اُس کو اس مصیبت سے چھٹکارا دے یا صبر کی طاقت۔ وہی اس کا بہتر فیصلہ کرے گا تم اتنا کرو کہ یہ سب خان رئیس کے کان سے گزار دو۔ وہ نیک دل آدمی ہے اور اس سازش سے بھی بے خبر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کارروائی کرے اور تمہارا بیٹا صحیح سلامت تمہیں مل جائے گا۔" کنیز نے بڑھیا کو اُمید دلائی۔

صبح سویرے ہی شہزادی کی آنکھیں کھل گئیں۔ رات بہت دیر سے سو رہنے کی وجہ سے نیند کا خمار اب بھی موجود تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے جوڑا پہنا۔ معمولی حرارت اب بھی تھی اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی دروازے سے ذرا آگے تھی تو اُس کی ماں کی دی ہوئی کنیز صفورا آ گئی اور اس کے پیر چھونے لگی۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی یوں لگتا

تھا جیسے وہ ساری رات جاگتی رہی ہو۔ شہزادی پریشان ہو گئی۔

"کیا بات ہے صفورا تم یہاں کیا کر رہی ہو"۔ صفورا کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ "تم بتاتی کیوں نہیں" شہزادی نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔"

خونشرہ، رانی تمہیں دھوکا . . . . . . دھوکا۔

"کس کو دھوکا۔ کیسا دھوکا" شہزادی نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

خونشرہ، تمہاری شادی ایک گونگے شخص سے کر دی گئی ہے۔ کنیز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔

"میری شادی ایک گونگے شخص سے صفورا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

ہنہیں ہنہیں شہزادی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں شہزادی لرز کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹ کانپنے لگے۔ کنیز کی زبان سے یہ بات سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ پھر جلدی سے کنیز کو ساتھ لے کر باغ کی طرف نکل گئی۔

صفورا جلدی بتاؤ یہ کیا بات ہے۔ تمہیں کس نے بتایا۔ شہزادی کی ٹانگیں اب بھی تھر تھرا رہی تھیں اور اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ شہزادی سخت پریشانی کی حالت میں تھی۔ پھر کنیز نے سارے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ خونشرہ تمہاری بارات میں جو شخص شہزادہ بن کر گوپس آیا تھا وہ ایک غریب ماں کا بیٹا تھا۔ ملکہ چترال نے انتہائی رازداری سے اس کو شہزادہ بنا کر روانہ کر دیا تھا۔ خان رئیس نے جس وقت شاہی قافلہ کو تمہاری شادی کے لئے گوپس بھیجا تو اس وقت ملکہ رئیس نے قافلے کے سردار کرم رئیس سے ساز باز کر کے اس نوجوان کو بھی دھوکا دے کر دولہا بنا دیا تھا۔ وہ گونگے شہزادے کا ہم عمر تھا۔ دونوں نے ایک غریب ماں کا دودھ پیا ہے۔ ملکہ اس نوجوان کو شہزادہ بنا کر اس لئے گوپس بھیجا تھا کہ حکمران گلگت اور اس کی بیٹی کو

دھوکا دیا ہے۔ اور رسم نکاح دستور کوہستان کے مطابق چترال میں ہی ہونی تھی اور راستے میں اس نوجوان کو قتل کرا دیا گیا۔ ملکہ رئیس نے اب اس عورت کو یہ کہہ کر دھوکا دیا ہے کہ تمہارا بیٹا محل گوپس میں فوت ہوا اور شاہ گوپس نے اسے دفن کر دیا۔ بے چاری بوڑھی عورت کا برا حال ہے۔ ملکہ رانی "میں رات بھر نہیں سوئی اور آپ کا انتظار کرتی رہی" تاکہ سارے حالات واقعات خونخوار سے کہہ دوں"۔ کنیز ساری باتیں تفصیل سے سناتی رہی۔ شہزادی ہاشم جو ابھی تک اس کی باتیں سن رہی تھی، گم سم پریشان حال خلا میں گھورتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ آئی۔

اچھا صفورا تم جاؤ ——— اس پر بعد میں سوچیں گے۔ اس کے جانے کے بعد شہزادی اپنے کمرے کی طرف گئی اور اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ ایک لٹے ہوئے مسافر کی۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ بستر پر پڑی دیر تک حالات پر غور کرتی رہی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا۔ میں جان جان دے دوں گی لیکن اس شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ جس راستے سے میری بارات آئی تھی اسی راستے سے میرا جنازہ جائے گا۔

کل تک اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بہار کے ساتھ خزاں بھی ہے، پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی۔ خوشی غم میں، قہقہے آہوں میں، نغمے آنسوؤں میں بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی آرزوئیں دم توڑنے والی ہیں۔ اس کی امیدیں منہ پھیرنے والی ہیں۔ شہزادی اس وقت ایک گہری سوچ میں تھی اور اپنے باغی ذہن میں ایک فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کیا وہ مہمان شہزادہ بھی اس سازش میں شریک تھا۔ شہزادی کچھ سوچ کر اپنے آپ سے کہنے لگی "نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔ ملکہ نے اس کو بھی دھوکا دیا ہے۔ وہ میرے باپ کو دھوکا دے سکتی ہے تو اس کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ میں اس کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی ہوں۔ وہ بھی مظلوم تھا میری طرح۔ لیکن میں اس سازش میں ملکہ کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی کبھی بھی نہیں کسی صورت میں بھی نہیں۔ شہزادی نے ایک عزم کے ساتھ اپنے آپ سے کہا۔ میں اس کو من میں بسا چکی ہوں وہی میری منزل

ہے وہ ہی میرا ساحل" اور وہ ہی میری تقدیر"۔ شہزادی ہاشم یہاں تک سوچ کر اپنے بستر سے اُٹھی اور وضو کر کے بارگاہِ ایزدی سے دعائیں مانگتی رہی اُس کے خوب صورت اور نرم و نازک ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شاید وہ ان آنسوؤں سے اپنی تقدیر کی لکھی کو مٹانا چاہتی تھی۔

اسی اثنا میں شہزادی بلقیس اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"اب کیسی ہیں آپ شہزادی ہاشم"؟

"اب ٹھیک ہوں ——— معمولی بخار ہے"

بلقیس نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

اوہ تمہیں تو تیز بخار ہے۔ میں حکیم کو بلاتی ہوں اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ملکہ رئیس کمرے میں داخل ہوئی اور مزاج پرسی کرنے لگی کہ اتنے میں حکیم اندر داخل ہوا جس کے ہمراہ بلقیس بھی تھی

"شہزادی صاحبہ آپ ابھی تک ٹھیک نہیں ہو سکیں ——— "کیا آپ رات جاگتی رہی ہیں"؟

"نہیں ——— میں سوئی تھی ——— مگر سر کا درد کم نہیں ہو رہا۔ شہزادی نے جواب دیا حکیم دوائیں پیتے اور آرام کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

"آرام۔ آرام بس آرام ہی حکیم صاحب کا علاج یہی ہے"۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ملکہ رئیس نے طنزاً کہا۔

شاید حکیم ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا مجھے آرام کی ضرورت ہے مجھے سکون چاہیئے شہزادی زیادہ دیر اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکی اُسے ان سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اور وہ اس محل سے دور۔ بہت دور چلے جانا چاہتی تھی محل کی دیواروں سے اسے وحشت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ملکہ رئیس کچھ دیر شہزادی ہاشم کے

پاس ٹھہری اور پھر آرام کرنے کا کہہ کر جانے لگی۔ اتنے میں ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی چال مینڈک کی طرح تھی چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کے پیچھے ہی کنیز صفورا نے معنی خیز نظروں سے شہزادی ہاشم کی طرف دیکھا شاید بتانا چاہتی تھی کہ یہی ہے شہزادہ کوہستان ——
کمرے میں بیٹھی ہوئی تین کنیزیں کن انکھیوں سے ہاشم کی طرف دیکھنے لگیں" جو ملکہ رئیس کے ساتھ کمرے میں آئی تھیں۔ شہزادی ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر تڑپ گئی جو اس کی قسمت کا مذاق اڑا رہی تھیں اس کے چہرے پر حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ شہزادی بلقیس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور سر جھکائے بیٹھی رہی۔ شہزادی ہاشم سے نظریں ملانے کی طاقت اس میں ختم ہو چکی تھی اور وہ کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھی تھوڑی دیر کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر شہزادی کی آواز کمرے کی خاموش دیواروں سے ٹکرائی۔

"کیا یہ ولی عہد شہزادہ صاحب تشریف لائے تھے"۔ شہزادی ہاشم کے سوال پر سبھی خاموش رہیں۔

"ہاں"۔ یہ آواز بلقیس شہزادی کی تھی جو بہت مشکل سے منہ سے باہر نکلی تھی"۔

"اچھا" تو یہ آپ کا بھائی شہزادہ ہے"۔ خوب۔ بہت خوب"۔ شہزادی ہاشم کا لہجہ انتہائی حقارت آمیز تھا۔ تھوڑی دیر تک سب کی گردنیں جھکی رہیں سبھی کمرے سے باہر نکلنے کے متعلق سوچ رہی تھیں کہ اتنے میں باہر سے ایک کنیز آئی اور دوسری کنیزوں کو آواز دی۔ ان کی مشکل ہوئی اور باہر نکل گئیں۔

اتنے میں ملکہ رئیس کی ایک خصوصی کنیز نے آکر بتایا کہ ملکہ ناشتے پر انتظار کر رہی ہے شہزادی بلقیس اٹھ کر جانے لگی تو ہاشم نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر کہا :-

"ملکہ سے کہہ دو کہ انتظار کی زحمت گوارا نہ کریں۔ مجھے بھوک نہیں لگتی"۔ اس کی زبان سے ٹھوک سا جواب پا کر بلقیس کنیز کے ہمراہ باہر نکل گئی اور شہزادی ہاشم اکیلی رہ گئی

شہزادی نے دو دن سے کچھ نہیں کھانا تھا۔ آج کا دن شہزادی کے لئے قیامت کا دن تھا جو اپنے ساتھ بے شمار دکھ سمیٹ لایا تھا۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ شہزادی ہاشم کو اپنی بے بسی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ محل رئیس سے نکل جانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ اُس نے اپنی کنیز صفورا کو ایک مہم سونپی تھی۔ یہ مہم انتہائی خطرناک تھی۔ صفورا صبح سے اپنی شہزادی کے حکم کی تعمیل میں تھی۔ اس دوران کئی بار وہ اپنی خوشترہ سے ملنے اور ضروری ہدایات لینے کے لئے کمرے میں آئی تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ آج اس کو اس کی خالہ زاد بہن صحیفہ بہت یاد آ رہی تھی۔

رات تاریک تھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قسمت کی ستائی ہوئی شہزادی ہاشم دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلی۔ باہر صفورا کو منتظر پایا۔

"کیا ہم جا سکتے ہیں؟" ہاشم نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں خوشترہ" کنیز نے سرگوشی کی۔

شہزادی نے فوراً اپنے گلے سے ایک قیمتی ہار اتار کر اس کو دے دیا۔ کنیز ہار لے کر جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی محل رئیس کے صدر دروازے کی طرف چلی گئی۔ شہزادی کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ کنیز صفورا دروازے سے واپس آ گئی اور آہستہ سے کہا:۔

"خوشترہ، راستہ صاف ہے۔"

دونوں بڑے دروازے پر پہنچیں۔ سنتری نے فوراً دروازہ کھول دیا اور وہ باہر نکل آئیں اور ایک درخت کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول کر اس پر سوار ہو گئیں اور انہیں ایڑ لگا کر اس راستے پر ڈال دیا جدھر سے بارات آئی تھی۔ دونوں خاموش تھیں کچھ دور جانے کے بعد شہزادی نے پوچھا:۔

صفورا مہمان شہزادے کا کوئی سراغ ملا۔

یں نے بڑی کوشش کی مگر اس کے متعلق کچھ معلوم نہ کر سکی۔ شہزادی نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ دونوں گھوڑے ایک برق رفتاری سے مٹی کے ایک خطرناک ٹیلے سے گزر رہے تھے لات تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی آگے شہزادی کا گھوڑا تھا اور صفورا اس کے پیچھے آ رہی تھی دونوں ہی اپنے اپنے خیالات میں گم تھیں کہ اچانک شہزادی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس کا گھوڑا اپنی مالکن سمیت قلابازیاں کھاتا ہوا ایک گہرے کھڈ میں جا گرا۔ اور یہی مقام شہزادی کا آخری مقام ثابت ہوا۔

شہزادی ہاشم اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ گوپس کی حسین وادیوں میں رہنے والی شہزادی سرزمینِ کوہستان کی خاک بنی۔

شہزادی ہاشم کو فوت ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ مگر شہزادی کا مزار جو پاستو زیارت کے نام سے موجود ہے اس شہزادی کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آج بھی وہ کھائی جہاں گر کر شہزادی نے دم توڑا تھا اس کی یادوں کو ایک داستان کی صورت ہر آنے والے کو شہزادی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

مرزا سیّار

مرزا سیارؔ کا رومان نہایت سادہ اور معصوم عشق کی داستان ہے۔ درحقیقت یہی وہ عشقِ مجاز ہے جس کے طفیل وہ عشقِ حقیقی تک گئے اور کامرانیوں سے سرفراز ہوکر زندۂ جاوید ہو گئے۔ دل کی تڑپ سوز و گداز، جذبۂ اندرون اور قلب کے دیگر واردات سیارؔ کو اس مجاز کے خزانے سے ملے ہیں۔ مجاز کے یہ تربیت یافتہ حقیقت میں قدم رکھنے سے پہلے فارسی اشعار میں اپنے دل کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں ؂

نیست اندر سینہ آرامی دلِ بیتاب را
تا بکے دارم بدست ایں قطرۂ سیماب را
رفتہ رفتہ در حقیقت می کشد عشقِ مجاز
قطرہ قطرہ سوئے دریا می بُرد سیلاب را

یعنی دلِ بیتاب کو سینے کے اندر آرام حاصل نہیں۔ مَیں اِس قطرۂ سیماب کو کب تک اپنے ہاتھ میں رکھے رکھوں

عشقِ مجاز مجھے رفتہ رفتہ حقیقت کی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیونکہ سیلاب قطرہ قطرہ بحیرہ ناپید کنارت جاملتا ہے

مولینا تیر عشق حقیقی کی جن لذتوں سے لطف اندوز ہوئے ہیں وہ مجاز کے اس رومان کی مرہونِ منت ہے۔ رومان کی یہ داستان اب تک ضبطِ تحریر میں نہیں آسکی۔ دو سو سال پرانی یہ کہانی تفصیل کے ساتھ کسی کو بھی معلوم نہیں اور جزئیات میں چند ایک واقعات زبانی طور پر لوگوں میں عام ہیں۔ یہ چند واقعات لوگوں کے ذہنوں میں منتقل ہوتے ہوتے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس رومانی داستان کے مشہور ہونے کا سبب وہ کھوار اشعار ہیں جنہیں "یارِ من ہمیں" کہا جاتا ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ آج تک وہ بھی تحریری صورت میں قلمبند نہیں کئے گئے ہیں بلکہ سینہ بہ سینہ محفوظ ہیں۔

چترال ایک تنگ وادی ہے۔ دونوں طرف پہاڑ ہیں۔ وادی کے درمیان دریا بہتا ہے دریا کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے پہاڑوں کے دامن میں گاؤں آباد ہیں۔ اندورسے بمدوغیل تک سینکڑوں میل لمبائی کی اس وادی میں آبادیوں کا یہی نقشہ بنتا ہے۔ دریا کے کنارے کنارے گاؤں اور گاؤں کے اوپر بائی رو چھینی" یعنی چراگاہ۔ پھر اونچے اونچے پہاڑ۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے مناظر کو خوب دیکھا جا سکتا ہے۔

شوگرام اور ریشن دو ایسے گاؤں ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے آباد ہیں۔ درمیان میں دریا بہتا ہے۔ شوگرام مغرب کی طرف ہے اور ریشن مشرق کی طرف۔ دونوں گاؤں کے درمیان ایک پل ہے جو رابطہ کا کام دیتا ہے۔ اب یہ پل لکڑی اور لوہے کے تاروں کا بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں دریائے چترال کے اوپر یہ پل بید کی شاخوں سے بنا ہوا تھا۔ اس قسم کے پلوں کو "تیلی سیر" (یعنی بید کی شاخوں سے بنا ہوا پل) کہتے ہیں۔ سوائے اس تیلی سیر کے شوگرام اور ریشن میں نقل و حمل کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ دونوں گاؤں دریا کی سطح سے بہت اونچے ہیں۔ اس لئے اُن کی آب پاشی دریا کی مرہونِ منت نہیں بلکہ شوگرام کے بیچ میں ندی بہتی ہے جو شوگرام کو سیراب کرتی ہے اور ریشن کے بیچ میں ریشن گول

کی وہ مشہور ندی ہے جس کے پانی میں فولاد زیادہ شامل ہے اور جسے صحت بخش پانی کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوگرام کی بہ نسبت ریشن زیادہ زرخیز اور شاداب جگہ ہے۔ شوگرام اور ریشن کی مٹی میں بھی فرق ہے شوگرام کی مٹی سیاہی مائل چکنی مٹی ہے اور ریشن کی خاک سرخ اور سرخی مائل ہے۔ تمام گاؤں سرخ سا لگتا ہے۔ آبادی اور رقبے کے تناسب کے لحاظ سے ریشن، شوگرام سے بڑا بھی ہے، اور پرانے زمانے سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہے۔ قدیم زمانے میں قافلوں اور کاروانوں کی گذرگاہ ریشن میں سے تھی اور اب بھی آمدورفت کی سڑک ریشن میں سے ہی گزرتی ہے۔ اور چوگان بازی کا میدان بھی ریشن میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

ماہ جون کے ابتدائی دنوں میں دھوپ کی گرمی اور برف پوش پہاڑوں سے آئی ہوئی ٹھنڈی ہوا کی آمیزش سے فضا نہایت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ بہار اپنے جوبن پہ ہے۔ نباتات نے سرتاپا بہار کا جامہ پہن رکھا ہے۔ شوگرام اور ریشن کے گاؤں اپنے حسین مناظر سے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ "شنیجواسپر" کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر ہے۔

شوگرام کے جنوبی ساحل پہ جو ریشن کے بالکل سامنے ہے ایک تنومند وجیہہ صورت، شہزادے کے لباس میں ملبوس نوجوان پتھر پہ پہاڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، استغراق میں محو، ٹکٹکی باندھے ریشن کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق اور تجسس بھرا ہے۔ نوجوان کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دمک رہا ہے اور ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ چہرے سے یاس اور ناامیدی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہر لمحہ امید کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور ہر لمحہ نہایت امید سے ریشن کی طرف دیکھتا جارہا ہے۔ کبھی حسرت سے اپنے گردو پیش پر نگاہ دوڑاتا ہے پھر فوراً پُرامیدی سے ریشن کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ بہار کا یہ پُرکیف منظر بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا ہے۔ پھولوں کی خوشبو، پرندوں کی چہچہاہٹ۔ مایون کی نغمہ سرائی، ڈھلتے سورج کا نظارہ۔ دریا کی موجوں کا شور۔ کوئی بھی چیز اُس کی توجہ ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔

وہ ان تمام سے بے نیاز، محویت کے عالم میں بیٹھا ہے۔ اور پھر اُس کی آواز فضا کو تسخیر کرنے لگتی ہے۔

ے
رو موسورین نوڑیکو رٹشنو کورو برون شیونیان
کورو برون کھیمو شیشونیاں جملہ گلستان بیر رٹشن

پہاڑ کے اوپر سے نگاہ ڈالیں تو تمام کھیت اور کیاریاں لہلہاتی ہیں کھیت اور کیاریاں ہی نہیں بلکہ رٹشن سارا گلستان بنا ہوا ہے۔

پھر اچانک پہاڑ پر جھاڑیوں کے قریب دو پرندے "اِشتقیقی" آبیٹھتے ہیں اور پہاڑ کی بلندیوں پر "چغرڑی" محوِ پرواز ہے۔ یہ دونوں چیخنے لگتے ہیں اور اپنے اپنے راگ نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ دونوں کی اس حرکت کو نوجوان مداخلت سمجھتا ہے اور نہایت سوز کے ساتھ گانے لگتا ہے۔

ے
چغرڑی چارغ مو کورے اوا بیابانہ آسوم
مو چوڑے اِشتقیقی بلبلو ارمانہ آسوم

(اے چغرڑی! چارغ چارغ نہ کر۔ اس بیابان میں میں بھی تو ہوں اور اے اِشتقیقی! تو بھی مت چہک میں اپنی بلبل کی تمنا میں یہاں بیٹھا ہوں)

یہ نوجوان شوگرام کے دوست محمد لال کا لڑکا محمد سیار تھا جو بعد میں مرزا سیار کے نام سے مشہور ہوا۔ رٹشن کی ایک حسینہ کو دل میں بسا لیا تھا فراق کی شدت کو کم کرنے کے لئے وہ ہر صبح اسی جگہ بیٹھتا اور نہایت اشتیاق سے رٹشن کی طرف اور معشوق کے گاؤں کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس امید پر کہ شاید ایک جھلک ہی نظر آجائے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے آج اور اب جب شام ہونے لگتی اور گاؤں کے چرواہے بھیڑ بکریوں کو جنگلوں سے گاؤں کی طرف ہانک رہے ہوتے کھیتوں میں کام کرنے والے ہل اُٹھائے ہوئے، گرد پونچھتے ہوئے گھروں کی طرف لوٹ رہے ہوتے۔ سورج کی کرنیں رٹشن کی پہاڑیوں کی دوسری طرف اُترنے لگتیں تو وہ

آخری نظر ریشن کی طرف ڈالتا اور پھر گھر کی طرف چل دیتا۔

یہاں آکر چُپ چاپ بیٹھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ایک جھلک کا متمنی تھا۔ اس خاتون کا جو ایک معزز خاندان کی شادی شدہ خاتون تھی۔ اُسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ دُور بہت دُور شوگرام کی پہاڑی پر کوئی بیٹھا اس کی ایک نظر کا خواہش مند ہے اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے پہروں گا تا رہتا ہے۔

مرزا محمد سیار ایک معزز گھرانے کا لڑکا، زیورِ علم سے آراستہ، شرافت کا پیکر اور بلند اخلاقی میں بے مثال نوجوان تھا۔ دینی حمیت اور خاندانی شرافت دونوں اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ کسی غیر عورت سے عشق نہ کیا جائے۔ مگر دل پر کسے اختیار حاصل ہے۔

ایک مرتبہ ریشن کی ایک تقریب میں محمد سیار نے اُسے دیکھا اور دل میں ایک خلش سی محسوس کی پہلے پہل اُسے ایک معمولی خلش سمجھ کر اتنی توجہ نہیں دی لیکن خلش تھی کہ درد بن گئی۔ شوگرام اور ریشن کے لوگ تقریباً ایک ہی برادری کے لوگ ہیں۔ اُن کے مفادات مشترک ہیں۔ وہ مربوط دیہی زندگی گزارتے ہیں۔ پُرانے زمانے سے وہ ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ اجتماعی کام میں دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہیں۔ اسی سبب سے ان کے میل ملاپ اور ایک جگہ جمع ہونے کے مواقع پہلے بہت زیادہ تھے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا زیادہ تھا۔ محمد سیار اکثر ریشن جایا کرتا۔ خرید و فروخت کرنے کے علاوہ کچھ دیر کسی دوست، رشتہ دار کے ہاں ٹھہرتا اور شام کو واپس لوٹ آتا۔ قومی جرگے اور اہم اہم کام بھی ریشن میں وقوع پذیر ہوتے تھے — چوگان بازی کے مقابلے میں ریشن کی "جنالی" میں ہوتے تھے اور محمد سیار چوگان بازی کا مانا ہوا کھلاڑی تھا چنانچہ یہ سب کچھ بہر ملاقات ثابت ہوا۔ اور روز روز کی دید نے آتش بھڑکانا شروع کر دی۔ پہلی ملاقات میں جو چنگاری اُس کے دل میں لگی تھی وہ اب آتش سوزاں بن گئی اور وہ اِس آگ میں تپتا اور جلتا رہا۔

معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا تقاضا تھا کہ اس کا عشق راز میں رہے اور محمد سیار نے اس آگ کو سینے سے باہر بھڑکنے نہ دیا۔ اور اندر ہی اندر جلتا رہا۔ اور انتہا یہ کہ اس آتش عشق سے اس کی محبوبہ بھی واقف نہ ہو سکی۔ اُسے علم نہیں کہ محمد سیار لال جو اکثر آتا ہے اس کے دل میں کیا کیا طوفان اُٹھے ہوئے ہیں۔ سیار نے مصلحت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن کہاں عشق اور کہاں مصلحت یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں چنانچہ اس نے بار بار پشن کی طرف جانا موقوف کیا اور شوگرام ہی میں اس پہاڑی کے اوپر جا بیٹھا جسے "زو موسورو" کہتے ہیں اور اکثر اوقات وہیں گزارتا۔ اور کوئے یار کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتا جاتا۔

محمد سیار کو عشق نے شاعر بنا دیا تھا جس کا شہرہ دور دور تک ہونے لگا تھا۔ وہ غزل اور مثنوی میں دل کی بات کہتا۔ واردات قلب و نظر محبوب کا حسنِ بے مثال، سیار کے دل کی جنونی حالت۔ درد کی شدت اور آگ کی سوزش۔ اس کے اشعار میں جھانکنے لگی۔ اور سیار کہتا رہا کئی سال بیت گئے۔ اسی دوران اس کی مشہور نظم "یارِ من ہمیں" سامنے آئی چونکہ دل سے نکلے ہوئے اشعار تھے۔ ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے۔ اس لئے ان اشعار کو شہرت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ آناً فاناً مقبولِ عام ہو گئے اور بزم کی محفلوں میں گائے جانے لگے۔ سیار خود بھی اکثر انہیں گاتا رہتا تھا اور گنگناتا رہتا تھا۔ موسیقی سے اُسے بھی شغف تھا۔ ستار بجانے پر اسے عبور حاصل تھا اس لئے اس نے ایک خاص دُھن بھی اپنے اشعار کو دی اور "یارِ من ہمیں" اسی میں گائی جاتی ہے۔

شعر عام ہوئے تو ان سے عشق کی بو آنے لگی اور راز راز نہ رہا۔ اور اس کی خوشبو اُس کے محبوب تک جا پہنچی اور اُس کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے اور خدشات اور خوف سے مضطرب رہنے لگی۔ اس راز سے باخبر ہونے والوں میں شاید وہ آخری عورت تھی ورنہ اس کے گھر والوں سمیت ہر شخص سیار کے دل کی حالت جان گیا تھا۔ سبھی محمد سیار کے اخلاق کے گرویدہ تھے اس کی خاندانی شرافت اور اس کے علم کے سبب اس کا احترام کرتے تھے۔ اور سیار دل کے ہاتھوں

مجبور اپنے عشق میں اُس نے کبھی اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ وہ عشق کو پاکیزہ جذبہ سمجھتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں خود کہتا ہے کہ

خوشو کہ سیرو تزاغہ باغ او چ بیاباں مہ بو خوشش
آلتی بیٹیں مان بکو سر نو آلتی آرماں مہ بو خوشش ؎

(یارِ من ہمیں)

(دل جہاں گھومتا ہے وہ راستے، وہ باغ اور بیابان مجھے پیارے لگتے ہیں۔ وصل حاصل کر کے بجھانے سے مجھے فراق کی حالت میں وصل کی تمنا زیادہ پسندیدہ ہے۔)

اسی طرح وہ تصورِ جاناں کو عشق کی تسکین کے لئے ملاقات اور راز و نیاز سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ معشوق کے دیدار کی ذرا سی جھلک اُس کے لئے دُنیا میں سب سے زیادہ بہتر لگتی تھی۔ دوماں میں اُس نے جس ضابطۂ اخلاق کو پسند کیا تھا وہ نہایت پاکیزہ اخلاق کا ثبوت تھا۔ چنانچہ خود اُس کے اپنے الفاظ میں اس کا یوں ذکر ملتا ہے۔

تو کہ دریاہ شُرشُرتہ موژ دا اُو ہتو نو ادا
اِشپک نظر کرا ریت اللہ تہ پروشتہ دوسونو ادا ؎

(یارِ من ہمیں)

(تو اگر طوفانی دریا ہے تو میں تیرے اندر بھنور ہوں۔ اگر میں نے کوئی غلط نگاہ ڈالی تو میں اللہ کے سامنے اس کے لئے پکڑا جاؤں گا)

سیار کے اس معصوم اور یکطرفہ عشق نے اس کی محبوبہ کو نام دیا، اور لوگ اسے "یارِ من ہمیں" کے نام سے پکارنے لگے۔ گو خاتون کے گھر والوں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی تھی مگر عشق کا دستور نرالا ہوتا ہے۔

ایک دن گاؤں کی خواتین اکٹھی ہوئیں۔ اور سب نے سیار کی معشوقہ پر طنز کی کہ فلاں

تیرے عشق میں دیوانہ ہو کر تیری تشہیر کرتا پھرتا ہے۔" یارمن ہمبیں کو یہ باتیں بہت بُری لگیں اور مزاج کی برہمی کا یہ عالم ہُوا کہ نوکر کو ساتھ لئے کر غصّے سے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شوگرام کا راستہ لیا۔ وہ گاؤں سے باہر نکلی۔ اُس وقت سردیوں کے دن تھے اور برف باری ہو رہی تھی۔ راستے پر تقریباً گھٹنوں تک برف کی تہہ جم گئی تھی اور چلنے سے پاؤں برف کے اندر دھنس رہے تھے۔ کہر اور دُھند کا یہ عالم کہ چند گز آگے بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دن پر شب کا گمان تھا۔ یارمن ہمبیں نے اس خراب موسم کی کوئی پرواہ نہ کی تھی وہ آگے بڑھتی رہی۔ غصّے سے اُس کا چاند سا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ حُسن کی تلوار بے نیام ہاتھ میں لئے قتلِ سیّارہ کی مہم پر جا رہی تھی اور اپنا ہر اگلا قدم پچھلے سے زیادہ زور کے ساتھ رکھتی تھی۔

اُدھر محمد سیّارہ آج دن بھر ریشن کی طرف نگاہیں دوڑاتا رہا۔ لیکن دُھند کہر اور برف باری کی وجہ سے دیدار حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور، موسم کی خرابی کی پرواہ کئے بغیر "شوقِ" کو سر پر اوڑھ کر عازمِ ریشن ہوا۔ اور برف پر پھسلتا ہوا آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ شوگرام اور ریشن کے درمیانی پُل تک پہنچ گیا۔ آدھا پُل ابھی طے کیا ہی تھا کہ دوسری طرف سے آتی ہوئی "یارمن ہمبیں" اچانک شعلۂ جوالا بن کر اس کے سامنے آگئی۔ دُھند اور برف باری کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کو بہت قریب آنے پر ہی پہچانا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں حیرت زدہ ہو گئے۔ ظلم ہمیشہ قوی ہوتا ہے۔ "یارمن ہمبیں" آگے ہی بڑھنے لگی۔ یہ پُل ایسا تھا کہ اُس کی چوڑائی بالکل معمولی تھی۔ بمشکل ایک شخص کے چلنے کا راستہ تھا۔ جب اسی طرح دو انسانوں کا آمنا سامنا ہو جائے تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ ایک انسان یا تو واپس مڑے اور راستہ خالی کر دے یا پھر ایک طرف لگ کے اس طرح کھڑا ہو جائے کہ دوسرا اُسے چھو کر پاس سے گزر جائے۔ پُل کے تختے پر برف کی وجہ سے پھسلن تھی۔ ذرا پاؤں پھسلنے سے گرنے اور خوفناک انجام سے دوچار ہونے کا اندیشہ تھا۔ محمد سیّارہ کے لئے یہ صورت آزمائش کا مرحلہ تھا۔ اُس

نے سوچا اور اچانک ایک خوفناک فیصلہ کر بیٹھا۔

محمد سیار عاشقِ صادق تھا۔ اُس کے ذہن میں معاً دو خیال کوندے کہ پُل کے بیچ میں ایک طرف لگ کے دوست کو گزرنے کا راستہ دے۔ یہ ایسے موقعوں کے لئے عام اور مروّج طریقہ تھا اور کسی کو گزرنے کے لئے راستہ دینے کے لئے کمال ادب تھا۔ اگر ایسا کرتا تو کوئی عجیب بات نہ تھی بلکہ عین قرینہ تھا۔ لیکن محمد سیار نے اِس خیال کو مسترد کر دیا کہ اس کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس طرح سے محمد سیار کے کپڑوں اور جسم کے معشوق سے چھو جانے کا اندیشہ تھا اور اُس کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس گناہ کا مرتکب ہو جائے۔ دوسرا خیال اس کے ذہن میں یہ گزرا کہ پیچھے مڑ کے واپس چلے اور دوست کے لئے پُل کو خالی کر دے۔ ایسے تنگ راستوں میں راہگیروں کا ایک دوسرے کو راستہ دینے کا یہ طریقہ بھی رائج تھا۔ اس میں دوسرے کے لئے یعنی اس کے لئے راستہ خالی کیا جاتا ہے۔ عزت، توقیر اور حوصلہ افزائی کی بات ہوتی ہے کہ راستہ سے ہٹ کے اس کے گزرنے کے لئے جگہ خالی کی جاتی ہے۔ محمد سیار اگر اس طرزِ سلوک کو روا رکھتا تو عین قابلِ قبول بات تھی اور معشوق کو بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا لیکن اس نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا کہ اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ پلٹ کے چلنے میں معشوق کی طرف پیٹھ کرنی پڑتی تھی جو بے ادبی کے مترادف تھا اور اس بے ادبی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

لہٰذا اُس نے دل میں فوراً فیصلہ کیا کہ اُلٹے پاؤں چلنا چاہیئے تا کہ دونوں خامیاں نہ رہیں کہ معشوق کو چھونے کا گناہ بھی نہ ہو اور پیٹھ کرنے کی بے ادبی بھی نہ ہو۔ وہ منہ معشوق کے رُخِ تاباں کی طرف کئے پھسلان اور لرزاں پُل پہ اُلٹے پاؤں چلتا رہا۔ آنکھیں چہرۂ یار پہ گڑ گئی ہیں۔ گردن موڑ کے راستہ دیکھ کے اُلٹے قدم لینے کی مُہلت اِس لئے نہیں تھی کہ سامنے چاند ہے جس سے نظریں ہٹانا اُسے پسند نہ تھا۔ اُلٹے قدم چلتا رہا لیکن پھسلن کی وجہ سے اچانک

لڑکھڑا گیا اور دوسرے ہی لمحہ وہ دریا کی موجوں سے جا ملا۔

شوگرام کا پل دریا کے اوپر انتہائی بلندی پہ بنایا گیا تھا۔ پل سے نیچے دریا پہ نگاہ ڈالیں تو دونوں طرف کی ٹھوس چٹانوں میں گھری ہوئی گہری گھاٹی کے اندر کنواں سا لگتا ہے اکثر کمزور قسم کے انسان کا سر اس منظر سے چکرا جاتا ہے لیکن محمد سیار اتنی بلندی سے دریا میں گرا صرف اس مقصد کے لئے کہ چھو جانے پہ گناہ اور پیٹھ پھیرنے پہ بے ادبی شانِ عشق کے خلاف باتیں ہیں۔ یہاں سچائی کا عشق ہے جو معشوق کی رضامندی کے علاوہ تمام خوف خطر سے بے نیاز ہوتا ہے۔

محمد سیار تیراکی میں تجربہ کار اور موجزنی سے واقف تھا۔ تیر کر دوسرے کنارے یعنی ریشن کی طرف والے کنارے نکلا اور دریا سے نکل کر برف کی سطح پہ بھیگے ہوئے موٹے اونی کپڑوں کے ساتھ کاٹتی ہوئی سردی کی پرواہ کئے بغیر ریشن کی طرف چلتا رہا۔ اور اس منجمد کرنے والی ہوا کے مقابلے میں اپنے عشق کی گرم ہوا سے تپش حاصل کرتا رہا۔ بالآخر ریشن گاؤں پہنچا۔ سیدھا "یارِ من ہمیں" کے پڑوس میں ایک ہمسائے کے گھر گیا۔ گھر کے مرد نے دیکھا کہ لال کے کپڑے اس کے جسم پہ شدتِ ہوا کی وجہ سے منجمد ہوگئے ہیں۔ اس نے اس حالت کو دیکھ کر پوچھا کہ "اے لال! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" محمد سیار نے جواب میں تمام ماجرا بیان کیا۔ اس نے ماجرا سن کر کہا "تیرے یار نے تو تجھے اجل کا نوالہ بنایا تھا مگر خدا کی طرف سے مزید تمہیں کتنی گزارنی ہے۔ محمد سیار جواب تک گھر کے آتشدان کے قریب مخصوص نشست "کرڑوپ" میں بیٹھ چکا تھا اور بھیگے کپڑے آگ کی طرف خشک ہونے کے لئے کر رہا تھا صاحبِ خانہ کی آخری بات سن کر کہا

کھیو کوم خوشو صنفاں مہ جام روئے حوران نادیر
مہ روح جنتو تے بیر خوش کہ تن ہوستین مہ نادیر

("یارِ من ہمیں")

(میں اپنی معشوق کی کون کون سی صفات بیان کروں۔ میری معشوق حوروں کی ملکہ ہے میری رُوح قفسِ عنصری سے جنّت کی طرف پرواز کرے گی اگر یار اپنے ہاتھوں سے مجھے مار ڈالے)

اس واقعے نے اس لڑمان کو وہ شہرت بخشی کہ عشق میں محمد سیاّر کی شخصیت کو ضرب المثل قرار دیا گیا۔ یار من ہمیں نے بھی اس واقعے کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا اور کبھی غصّے کا اظہار نہیں کیا۔ اب ذرا یہ دیکھئے کہ محمد سیاّر کی معشوق کیسی تھی؟ جس نے سیاّر کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا ان کا جواب خود سیار کے کھوار کلام سے ملتا ہے۔ "یار من ہمیں" نظم سے ملتا ہے جس میں یار من ہمیں کی تعریف اس نے اِن الفاظ میں کی ہے۔

نہ ملائک نہ پری نہ آدمی نہ میر ژوری
الله نہ قدرتہ قسمہ بندگاں آژونی

(یارِ من ہمیں)

(وہ فرشتہ نہیں ہے، پری نزاد ہے نہ آدم نزاد۔ اُس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ اُسے کیا سمجھا جائے۔ وہ ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ میرے اللہ تیری قدرت کتنی عظیم ہے کہ اس قسم کے بندوں کو پیدا فرمایا ہے" اور معشوق کا حُلیہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

شوں لعل دون دوردانہ مرژا فوہر نونمکیں
چھیتی مار کرونگو چھار ور سیرد ہر دیو بلیتن
نمکین بو آسونی مرچھیک خوبا نان حکیم
نہ خوشاں چھلئے متے گیارنہ دیشیان کو خوشو یوم

یورِ وسارتہ مونغ اِشپیرِ و مسوسارتہ گوڑ اِشپیرِو

مہ ژان مہ غورانو ہاؤ نیسے ہوئے مہ عمر پھیرُو

تہ گوڑ بیا ضئے مہ ژان وو ری گل سمبار نوا

تہ غیچ غیڑ یئرِ و مسارتہ پھتوک خنجار نوا

(میری جانِ عزیز کے ہونٹ لعل کی طرح اور اُس کے دانت موتی کی طرح اور اُس کی ہر ادا نہایت پیاری اور دِلرُبا ہے۔ اگر یہ بات کرے، سیّار کو ایسا لگتا ہے کہ اُس کے دل کی رگ ٹوٹ کر دل کلیجوں پہ گر پڑے گا۔)

حسین لوگ بہت ہیں لیکن میری معشوق خُوباں کی افسر ہیں۔ میری یہ دُعا ہے کہ اے معشوق تیرے پیاروں کی دُعائیں مجھے لگ جائیں اور اُن کے مُنہ تک نہ دیکھوں جن سے تُو نفرت کرتی ہے۔

چمکدار سُورج سے زیادہ چمکیلا تیرا چہرہ ہے۔ اور ماہِ تاباں سے زیادہ تابناک تیری گردن ہے۔ دلبر نے میری کوئی خبر نہیں لی۔ اور اب میری عمر ڈھل چُکی ہے۔

(ہائے۔ تیری یہ صاف اور شفاف گردن۔ تیری گُل "سمبار" جیسی مہک، تیری دُھلے ہُوئے موتی جیسی آنکھیں اور تیری خنجر جیسی آبدار پلکیں)

پونگان زمینہ مو دیت ڈھکئے مہ ہر دیا ڈھو نی

پونگان نکھی ہر دیہ ہر دیو ڈھو میکوت دُونی

(تو اپنے پاؤں زمین پہ نہ رکھ بلکہ میرا دل تمہارے قدموں کے لئے فرشِ راہ ہے قدموں کو میرے دل پہ رکھ اور میرے دل میں درد کا اندازہ کریں)

ایک بار محمد سیار ملاقات کا ارمان لے کر "یارِ من ہمیں" کے دروازے پہ آتا ہے وہ باہر نکلتی ہے اور اُس کے ساتھ باتیں کئے بغیر واپس چلی جاتی ہے اور محمد سیار کے دِل میں

روشنی کا ظہور ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس موقع پر اُس کی زبان سے یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں :-

آسمانہ مس پی نیسی اچی غائب ہوئے کھوٹو سوم
مہ چھیک واکھیو لو دوئی موغوتہ کھنگال غوٹو سوم

(یارمن ہمیں)

(آسمان پر مہتاب طلوع ہوتے ہی بادل کی اوٹ میں چھُپ گیا۔ میری معشوق میرے جیسے احمق گونگے سے کیوں بات کرے)

ریشنو بوم رنگ گانی شیرمہ خوشو یاقوت شنارکی
مہ شان خبر گنی تائے مشرانہ ملنگ کو رارکی

(یارمن ہمیں)

(خاکِ ریشن نے سرخ رنگ جو پایا ہے وہ میرے دوست کے یاقوتی ہونٹوں کے طفیل ہے۔ یار نے پوچھوا لیا کہ دروازے پر ملنگ جو آیا ہے وہ کہاں کا ہے؟)

ریشن کی مٹی عام طور پر سرخی مائل ہے۔ مرزا سیار کے مطابق یہ سرخی دوست کے گلابی ہونٹوں کی سرخی ہے۔ اسی خیال کو اپنے دوسرے شعر میں اِن الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

دوستو یاقوت شنارکی راغینو بوم رنگ گیزان
دوستو چوسیتہ پروشتہ حُورا تان چھارغ زان گیزان

(یارمن ہمیں)

(میرے دوست کے یاقوتی ہونٹوں کی برکت سے راغین کی مٹی نے رنگ حاصل کیا ہے اور میری دوست کے حسن کے سامنے حوروں کا حسن ماند پڑ گیا ہے)

سیار کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی بھی اس کے عشق سے آگاہ تھی۔ مگر اس نے کبھی شکایت

نہ کی۔ایک دن اس نے سیاؔر سے بے اعتنائی کی شکایت کی اور کہا کہ "مردوں کے پاس آنکھیں نہیں ہوتی ہیں جس عورت پہ تم فِدا ہو گئے ہو وہ مجھ سے کس بات میں اچھی ہیں"۔ محمد سیاؔر نے برجستہ جواب دیا۔

چو ستیو کھونگرو نیزی نوش گیتی ہیرا کی پرائے
تھے تہ چقہ چقہ کیمیریان گوُرچ گو جے بیگم لہہ کائے

(یارمن ہمیں)

(حُسن کا شمشیرِ بے نیام لے کر میری معشوق جب نکلے گی تو اے خاتون! تیری طرح کی عورتیں کونوں کھُدروں میں چھپ جائیں گی")

ایک بار ریشن کی خواتین زیارت کے لئے بابا ایوب علیہ الرحمتہ کے مزار پہ واقع گہکیر گئی تھیں چونکہ گہکیر کو ایک راستہ شوگرام میں سے ہو کر گزرتا ہے۔عورتیں مزار پہ فاتحہ پڑھنے کے بعد واپسی پہ شوگرام کے راستے آئیں اور دوپہر کے وقت شوگرام پہنچ گئیں۔راستہ محمد سیاؔر لال کی حویلی کے پاس سے گزرتا تھا۔وہ کافی تھک چکی تھیں اور سب نے بالاتفاق محمد سیار کے گھر آرام کرنے اور کھانا کھانے کا فیصلہ کیا اور یارِمن ہمیں سے کہا کہ آج دیکھتے ہیں کہ سیاؔر تیری کیا خاطر کرتا ہے اُس نے بھی مخالفت نہیں کی اور عورتوں کے ساتھ سیاؔر کے گھر گئیں۔

محمد سیاؔر گھر پہ موجود تھا۔گھر کے پاس "کھول" (کھلیان) کے قریب بیٹھا تھا۔اس نے نوکر آٹھ بیلوں کو لے کر اناج صاف کر رہے تھے۔خواتین کو گھر کی طرف آتے دیکھ کر اور "یارِمن ہمیں" کو اپنے گھر میں دیکھ کر اُس کی خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔

یار کے رونق افروز ہونے پہ تشکر کے جذبات سے معمور ہو گیا اور فرطِ خوشی سے خادموں یا گھر کے کسی اور فرد کو کہنے کی بجائے خود ہی بساط اُٹھا لایا اور چنار کے سائے میں "نخ بُر" بچھا دی۔خواتین بیٹھ گئیں۔لال کے جذبات عشق متلاطم اور موجزن ہو گئے۔یار کی رونق

سے گھر گلستان بن گیا تھا۔مہمان نوازی میں محمد سیارہ شہرت کا مالک تھا اس کے دستر خوان پہ گوناگون قسم کے مہمان بیٹھتے تھے اور وہ ان کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا تھا۔آج اُسے اپنی قسمت پہ ناز تھا چنانچہ مہمان خواتین کی خاطر تواضع دل سے کر رہا تھا۔"ٹھیروئی" (خدمت) کے فرائض خود ہی انجام دے رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد خود ہی مہمانوں کے ہاتھ دُھلائے اور دستر خوان بچھا کر اندر گئے اور اندر سے کھانوں کے خوانچے اُٹھاتا ہوا آیا اور دستر خوان پہ کھانا چُن دیا گیا۔مہمانوں نے جب کھانوں کی طرف دیکھا تو نہایت صاف ستھرے دستر خوان پہ سادہ پتیری روٹیاں اور کلیم کرداچی" (سلاد) کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔عورتوں نے کہا "یہ کیسی دعوت ہے یار کے لئے اِس قسم کی دعوت ہوتی ہے"؟

محمد سیارہ مُسکرایا۔اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔اُس نے کہا یار کے لئے بہترین کھانا تو یہی ہے جو پیش کیا گیا۔اس سے اُن کی نازک مخروطی انگلیوں پر میل جمے گی نہ اُس کے یاقوتی ہونٹوں کا رنگ بدلے گا۔آپ کی دعوت کا بندوبست میں اب کرتا ہوں"۔اتنا کہتے ہوئے وہ نوکروں کی طرف مڑے جو بیلوں کو "گرکھول" پر کام کر رہے تھے اور حکم دیا کہ یہ آٹھ بیل اِسی وقت ذبح کئے جائیں اور دعوت کا اہتمام کیا جائے۔نوکروں نے حکم پاتے ہی آٹھ کے آٹھ بیلوں کو اُسی وقت ذبح کیا اور گوشت کا ڈھیر کر دیا۔مہمانوں کے لئے الگ رکھنے کے بعد لال کے حکم پہ تمام گوشت شوگرام والوں کو بانٹ دیا گیا۔

ایک بار ریشن کی "جنالی" میں چوگان بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔محمد سیارہ کا گھوڑا "ہٹوتناغ" (چراگاہ) پہ چرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔پولو کے لئے اُس نے ایک دوسرے شخص کا گھوڑا مانگا تھا لال کو اپنے "سُرخن" پر فخر تھا جو بہترین تمکی نسل کا گھوڑا تھا اور پولو کے میدان میں ہمیشہ شہ زوری کا ثبوت دیتا تھا۔پولو کے کھلاڑی ایک خوبصورت لباس پہنتے ہیں جو اس کھیل کے لئے مخصوص ہے محمد سیارہ نے دیکھا کہ مستعار لیا ہوا گھوڑا اچھی نسل کا نہیں ہے اس پر سواری اور کھیل

اُس کی شان کے مطابق نہیں چنانچہ اُس نے روایتی لباس پہننے کے بجائے چرواہوں جیسا لباس پہنا۔ پاؤں میں "ناچنک" لپیٹ کر "پائے تو" باندھ کر اور پیٹھ پر "وارنگ" (پوستین) ڈال کر میدان میں نکلا اور اتفاق سے خوب کھیلا اور خوب داد حاصل کر لی۔ اُس کی معشوق بھی اس مقابلے کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے طنزاً پوچھا یہ رایت (گنوار) کون ہے جو خوب کھیلتا ہے؟ یہ بات لال تک پہنچی تو اُس نے یہ اشعار کہے

مہ تن سُرخن بیرووا جام تتے رایت کو ریسان
یشمغان پرنیج نوپاشئے جم تتے غیرت کو ریسان
مہ تن سُرخن کی بیسیر ہاڑ نو ہیتی رت بیسیرا
تن کل یارانن گنی جھیک متے رایت ریسیرا

(یارِ من ہمیں)

(میرا اپنا سُرخن ہوتا تو میں خوب خوب گنوار پنا دکھاتا۔ اور ریشن والوں پر سبقت لے جا کر خوب خوب غیرت دکھاتا)

(میرا اپنا سُرخن ہوتا تو ضرور گول ہوتا اور میری یار اپنی سہیلیوں کے ساتھ مجھ کو "رایت" نہ کہتی)

چترال کی خواتین میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ گھر کے افراد کے استعمال کے لئے گرم کپڑے، موزے اور ٹوپیاں وغیرہ اور تجارت کی غرض سے بھی موٹے کپڑے بننے کے لئے اُون کا سُوت اور دھاگا خود ہی تیار کرتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہر گھر میں سُوت کاتنے کا چرخہ ضرور ہوتا ہے اور پرانے دنوں میں اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔ کائی "یارِ من ہمیں" کا چرخہ پُرانا ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا تھا لکڑی میں کیڑے لگ گئے تھے اور چرخے کے تمام چوبی پرزوں کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا تھا اور اُسے ایک نئے چرخے کی ضرورت تھی۔ ایک دن محمد یار کی موجودگی میں اُس نے اپنے خاوند

لال سے اِس مقصد کا ذکر کیا کہ چرخہ ناکارہ ہو چکا ہے اور نیا چرخہ کہیں سے بنوا دیجئے۔ محمد سیاّر نے معشوق کے اشارے کو بھانپ لیا اور اُس کے خاوند نے بھی جواب دینے سے پہلے سیاّر کی طرف دیکھا اور کہا کہ اس مقصد کے لئے ہم لال ہی سے گزارش کرتے ہیں کہ نیا چرخہ بنا دے۔ محمد سیاّر لکڑی کے کام کے ماہر تھے وہ پائے کے معمار اور ترکھان بھی تھے۔ اُس کے پاس تمام آلات موجود تھے۔ یہ سُن کر یار کی طرف فرطِ خوشی سے دیکھا اور وعدہ کیا کہ نیا چرخہ بنا کے لائے گا۔ خدمتِ یار کی اس لذت اور چاشنی سے لطف اندوز ہوتا ہوا کسی مزید خاطر تواضع کا انتظار کئے بغیر قلندرانہ شان سے اُٹھ کر رخصت ہو گیا اور درِ جاناں سے باہر نکلتے ہی اشعار گنگنانے لگا۔

اوہ تہ غلامو غلام خدمتو تے عار مہ نیکی
خدمت کو ردم اوچہ کوم نو کرم بے انکار مہ نیکی

(یارِ من ہمیں)

(میں تیرے غلام کے غلام کی بھی خدمت کرنے کو عار نہیں سمجھتا ہوں۔ میں تیری خدمت کرتا ہی رہوں گا اور انکار کبھی نہیں کروں گا)

اِسی کیف اور مستی میں وہ شوگرام پہنچا اور بغیر کسی تاخیر کے نوکر کو حکم دیا۔ "توُت بیدانہ کے اس بڑے درخت کو ابھی کاٹ کے گرا دو۔"

چرخے کے لئے زیادہ سے زیادہ چار فٹ لکڑی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن محمد سیاّر نے معشوق کی ذرا سی فرمائش پہ پورے درخت کو گرا دیا۔

محمد سیاّر کے لگن کا یہ حال ہے کہ توت کے ٹوٹے تنے اور ٹوٹی ہوئی شاخوں میں سے جو کاٹ کے بکھیر دیئے گئے ہیں ہر ایک کے پاس بار بار جاتا ہے اور ہر ایک کو جانچتا ہے۔ بالآخر اُس نے ایک ٹکڑے کو انتخاب کر لیا جس کی قسمت میں اُس کی معشوق کا چرخہ بننا تھا۔ دل ہی دل میں

سیاؔر اس لکڑی کے ٹکڑے سے رشک کرنے لگا۔ کئی دنوں کی مسلسل محنت اور محبت سے چرخہ تیار ہوا۔ اب چرخے کے لئے دھاگا ڈوری کا اہتمام دیکھیں۔ عام دیسی قسم کا سوتی یا اُونی دھاگا باآسانی دستیاب تھا لیکن اُسے موزوں نہیں سمجھا گیا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود اُسے عمدہ دھاگا نہیں ملا۔ محبوب کے چرخے کے لئے ریشمی دھاگا حاصل کرنے کے لئے بالآخر وہ ہندوستان روانہ ہوا بڑے لمبے سفر کے بعد ہندوستان سے ریشمی تار لایا۔ تار کے رنگ میں بھی والہانہ پن گھول کے رکھ دیا تھا۔ وطن واپس پہنچتے ہی چرخے پر ہفت رنگی ڈوری لگا کر اپنی پیٹھ پہ اُٹھا کر شوگرام سے ریشن پہنچ کر خدمتِ جاناں میں پیش کیا۔ اور محبوب کی خوشی پا کر سُرخرو ہوا۔

محمد سیاؔر کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ بار بار حسن کے دربار میں جانا اچھا نہیں ہے اِس سے غلط فہمیاں جنم لیں گی۔ اِس لئے وہ تصورِ جاناں کو وصلِ جاناں پر فوقیت دیتا تھا۔ نرالے عشق کی دلیل بھی کیا خوب دیتا ہے۔

ہمیش تہ دیہی گیکو ننہ نان دُنیا دار مہ جشور
کھشینتو گوڑ ودریکو گدائے قلمدار مہ جشور

(یارِ من ہمیں)

(تیری گلی میں بار بار آنے پر تیری ماں مجھے دُنیا دار سمجھے گی اور اگر کشکول گلے میں لٹکا کر عشق کا صدقہ مانگتا ہوا آؤں تو مجھے فقیر بے نوا سمجھے گی)

محمد سیاؔر اگرچہ عاشقِ صادق تھا۔ عاشقِ صادق کو رقیب کا خوف نہیں ہوتا ہے اُس کو اپنے عشق سے غرض ہے لیکن کبھی کبھی شکایت کی زبان استعمال کی ہے اور رقیبوں کو پسند کرنے پر دل نشین انداز میں شکایت کرتا ہے۔

ادہ کی تہ لڑیمان دوست مہ تچھنی خوری لڑیس
مہ ژان تہ سور اندر دُشمنو کستہ دری لڑیس (یارِ من ہمیں)

(میں تیری طرف دیکھتا ہوں اور تو بے رُخی سے دُوسروں کو دیکھتی ہے۔ میری جان تم پہ
قربان دُشمنوں کی طرف کب تک دیکھتی رہو گی)

کبھی محمد سیار اپنی معشوق کو شوگرام آنے کی دعوت بھی دیتا تھا۔ دعوت دینے کا انداز نرالا
ہوتا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

شُوبس شوگرامی بیتی رَشٹینوتے کی گوس کیانی بوئے
گمبوریان بڑوک بیتی شیر ہو چھو چھیران دوس کیانی بوئے

(دیارِ من ہمیں)

(دو دن شوگرام کی ہَوا کھا کے اگر ریشن واپس آئیں اور پھولوں کے غنچے کھِلے ہوئے
ہیں چند ایک کو اپنی زلفوں سے لگا دیں تو تیرا کیا بگڑے گا)

مرزا محمد سیار کا عشق آخری عمر تک جاری رہا۔ اور بالآخر اس کا رُخ عشقِ حقیقی کی طرف رو بہ پرواز
ہوا۔ لیکن یارِ من ہمیں اس کے شعری اظہار سے دُور نہ ہو سکی ؛

شیر ملکٹ گدیری لال

چترال کی برف پوش چوٹیاں، دریاؤں کی روانی، ندیوں کی طغیانی، صاف و شفاف چشموں کی فراوانی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، ہرے بھرے درخت اور سرسبز و شاداب وادیاں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ تو صبح دم شبنم آلود پھولوں کی سرگوشیاں، بلبل کی چہک، کوئل کی کو اور دل و دماغ کو طراوت بخشنے والے نسیمِ سحر کے جھونکے اکثر بذاتِ خود شعر نہیں لیکن ایامِ بہار میں ہر ایک کے دل کو ایک جمالیاتی ذوق سے شاداب کرنے اور شوقِ سخن کو نکھارنے کے لئے کافی ہیں۔ یہاں کی بہار اپنے ساتھ ایک انوکھی اور دلفریب رنگ لاتی ہے اور انسان کے ادبی ذوق و شوق کو مہمیز لگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا بچہ بچہ سخندان اور ہر اہلِ دل سخنور ہوتا ہے۔ اور یہاں کا ہر سخنور تخلیات کی اِن بلند فضاؤں میں پرواز کرتا ہے جہاں دل کے ہاتھوں ایک انسان دوسرے کا بے دام غلام بن جاتا ہے فکر و خیال میں ایک ہی پیکر سما جاتا ہے چترال کے ایسے ہی سخنوروں میں شیر ملک کا نام زبان زدِ خاص و عام ہے۔

شیر ملک المعروف گدیری لال چترال کا ایک نامور شاعر گزرا ہے جس کا زمانہ انیسویں صدی کے ربعِ آخر سے بیسویں صدی کے نصف اوّل تک تھا جب گدیری لال کا رومان اپنے شباب پہ تھا

اور ان کی شاعری جنون کے ساتھ عروج کو چھو رہی تھی۔ وصلِ یار کی آرزو دل کو چین سے جینے نہیں دیتی تھی۔ دن کا آرام عنقا تھا اور راتوں کی نیند حرام تھی تو رات دن بس یہی پکار رہتی۔

دوستو پوشین کی بسیر سمندرا سیر نمز سام

ے

ترانو کو نین بیر دا بو خصتو سار دی تیل نیز سام

(اگر وصلِ یار کی کوئی صورت ہوتی تو میں اُس کی فقط ایک جھلک دیکھنے کے لئے سمندروں کے اوپر پُل باندھتا۔ اور اگر معشوق کو خریدنا ہوتا۔ تو میں پتھر سے تیل بھی نکالتا)

شیر مُلک کی تاریخِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں۔ قرائن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کرنل لکھارٹ کی چترال کی آمد ۱۸۷۸ء کے بعد" فرنگی وو ہو" یعنی ۱۸۹۲ء سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ اور والئے چترال سر محمد ناصر الملک کی تخت نشینی ۱۹۳۶ء تک زندہ تھا۔ ان کا خاندان رضا خیل نوگرام موڑکھو میں شاہ کٹور اول کے زمانے سے آباد ہے۔ اُن کا باپ حسن الملک اور دادا شجاع الملک علاقے میں اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ تاہم اُن کے بھائی شہزاد الملک اور بیٹے میر نہ الملک نے شہرت نہیں پائی۔ پوتوں میں افضل الملک اور عبد الحکیم دو ہی نام ہیں بشیر مُلک کے خاندان کی رشتہ داریاں یارخون کی رضا خیل خاندان میں استوار تھیں۔ اِن کے دل میں جو عشق کی چنگاری اُٹھی۔ وہ چنگاری محبانہ کے ناپائدار جذبے سے نہیں اُٹھی بلکہ حقیقت کے لازوال جذبے سے اُٹھ کر شباب میں شرر فشاں پھر شعلہ بار اور آخر میں جاوداں ہو گئے۔ جیسا کہ شیر مُلک کہتا ہے۔

کیہ نو دیم تہ موشو تے چھور دُ بہشتہ مشرف

ے

اسپہ کھوار کو ریکو نارسی بان کو ر دنیان اعراف

(رقیب جو تیرے وصل سے شاداب ہے میرے لئے قابلِ قدر ہے کہ تو حورِ بہشت سے کم نہیں۔ اور وہ یعنی تیرا شوہر جنت کا مکین ہے اور میں تیرے ایک تصور کے ساتھ خود کو اعراف میں پاتا ہوں جہاں میری زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ کہا جاتا ہے کہ جس پہ شیر مُلک فریفتہ تھا

وہ رشتے میں اس کی غیر محرم لگتی تھی مگر اس کے لئے منکوحہ سے جدائی شرط تھی۔ اس لئے اس کو دُنیا میں حاصل کرنے کا تصور وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور یوں اُس کے لئے عمر بھر محرم تھی چنانچہ کہتا ہے)

دو تاڈ گوڈم بویان تدان تہ میلسو تے عشق امولو شال دے ایپا کو درخت

کہ چھوکیت شوم ھرذی نہ بیروتے لاڈیہ نہ وارِ ثوتے

(جب بھی سوچتا ہوں تیری جلوتوں کی یاد ہمیشہ مجھے ستاتی رہتی ہے عشق ایک طفیلی پودا ہے جب لگنے پہ آتا ہے نہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور نہ قرابت کا خیال رکھتا ہے) شیر ملک کا عشق آہستہ آہستہ جنون کی حد تک پہنچتا ہے تو اِدھر اُدھر سے اُنگلیاں اُٹھتی ہیں اور لعن طعن ہوتی ہے اور کوئے ملامت مقدر بن جاتی ہے۔ سماج کی بے رُخی اور لوگوں کی نادانی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی سنگدلی کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

ھائی مہ نامیرو رویان مہ مریتیان مہ واٹہ ینیان

پھوک تدان خدایو دیرو ناچوڑ بینیو کورہ لینیان

(اے لوگو! مجھے بُرا کہنے سے باز نہیں آتے ہو سُنو! لوگ تو مجھے گاؤں سے نکال دیئے ہیں اور میری جان کے بھی درپے ہیں۔ اُن کو پتہ نہیں کہ رُوح حکمِ ربی ہے۔ اگر ایک بار قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے پھر کبھی واپس نہیں لوٹے گی)

شیر ملک کے رومان میں جذبۂ عشق عروج پہ ہے اور جنون انتہا کو چھو رہا ہے۔ مگر ان کے ہاں محبوب کا دیدار اور دُنیا میں وصلِ یار کی کوئی تڑپ نہیں۔ اس کا رونا صرف یہ ہے کہ محبوب کا سراپا دِل میں سمایا ہوا ہے اور دلِ بیتاب اظہار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ تو کوئے ملامت میں پہنچتا ہے اور کبھی پند و نصیحت و ہدایت کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ دُنیا کی نظریں اُنہیں گھورتی ہیں اور محبت کے پاک جذبے کو دنیا کے میزان میں تولتے ہیں چنانچہ کہتا ہے:۔

گمبُودیان دیتو دیتی شُہ شوُ ترھنین بند کورو نیان
او اعشقو دیوانہ روئی مہ سرکوشنک کورونیان

(اے میرے دلبر جاناں یہ کیسے لوگ ہیں۔ میرے بچھڑے ہوئے پھولوں (نغمات) کو سیاہ دھاگوں سے (الزامات) باندھ لیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ میں جذبۂ عشق کا متوالا اور دیوانہ خود رفتہ ہوں۔ مجھے انگشت نمائیوں کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ راکھ کے ڈھیر جلی ہوئی لکڑیوں کی گواہی ضرور دیتے ہیں۔ دل تو میرا مجروح ہوا۔ ان لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت)

شیر ملک کے کلام میں سوز و گداز، درد، غمِ فراق اور رنج والم کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے جو میر تقی میر کے کلام کا خاصہ ہے۔ شیر ملک نے سوزِ دروں اور غمِ نہاں کو ایسے پیرائے میں ظاہر کیا ہے جو فلسفیانہ بھی ہے خیالات کی بلندی، تراکیب کا اچھوتا پن اور شعر میں بھرپور موسیقیت اُن کے کلام کو تمام ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ شیر ملک نے کھوار کے لوک ادب زُلفِ یار اور غم و ہجر و آرزوے وصل کے کئی نئے تصوّرات سے آشنا کیا جس طرح وہ رقیب روسیاہ کو قابلِ قدر سمجھتا ہے اسی طرح مخالفین کو اپنے سے قابلِ احترام سمجھتا ہے — اور کہتا ہے۔

عشقان جم تودی کو اسپہ دی کم رو لودو سیان
اسمانار ریاؤ زمینا ڈھوتیو سوم گوسوں بوسیان
دانگاہ چھوتیو موڑی لعل دوسانہ دی یعشیان

(اچھے یار لوگ جب بہت کچھ کہتے رہتے ہیں تو ہم بھی جذبات کی رو میں بہہ کر ایک آدھ بات کہہ جاتے ہیں اور تخیلات کی فضائے بسیط سے زمین پر آ کر پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ان پستیوں میں لعل و گوہر بھی مل جاتے ہیں)

شیر ملک کے رومان کا ایک منظر اُن کی وفات کے ساتھ پسِ پردہ چلا گیا. مگر ان کے لازوال گیتوں کے ہر شعر پہ ایک ایک منظر پوشیدہ ہے اور وقت کے پردۂ سیمیں پر یہ مناظر آتے رہیں گے. اور ان کے الفاظ میں یہ صدا گونجتی رہے گی.

بایونئے موبھوڑے کی مہ دیبار اَور کاری اَسور
تو تن تے اُوئی بس ددستو ھردی مہ سارہ چھبور

(اے مرغِ خوش نوا! اس چمن میں اپنی آواز کا جادو مت جگا. تیری کیا پروا تو اُڑ کر چلا جائے گا اور میرا محبوب جو کہ محوِ خواب ہے جاگتے ہی مجھ سے دل شکستہ ہو جائے گا)

عشق اور مُشک چھپانے سے کہاں چھپتا ہے. آخر ش شیر ملک کا عشق ایک ایک کر کے لوگوں کی زبانوں سے آشکارہ ہونے لگا. سُسرال والے لال کی اس جنونیت سے نہایت برانگیختہ. زمانے کی سرد مہری اور لوگوں کی انگشت نمائی سے تنگ آکر گدیری لال نے اپنے سارے گھر بار کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملنگی اور فقیری کا پیشہ اختیار کیا. دریں اثنا، جہاں بھی جاتے صرف اُن کے اشعار اور نغمات کے چرچے ہوتے. وہ ستار گود میں، جن کے تاروں کی ہر جُنبش سے اُن کی حقیقی اور ابدی عشق کی داستانیں اُجاگر ہوتی تھیں. جہاں بھی معشوق کی یاد ستاتی وہاں لال ستار پہ چند ایک عشقیہ راگ الاپ کر ذکرِ حبیب سے دل بہلاتے. نہ جانے ایک دن گدیری لال کے دل میں کیا سمایا سیدھے سُسرال کی طرف چل پڑا اور زبان سے ان اشعار کے چشمے پھوٹ رہے تھے.

جُست کھونگور ہا نو نو بیر ملکہ اشکارہ گل روئی تھبار
مہ تنان صور تو لاڑیرہ ھردی چھومیکار کیہ خبار

یہ بات سب پہ عیاں ہے بلکہ اظہر من الشمس کہ دو تلوار یہ یک وقت ایک میان میں نہیں سما سکتیں. اس بات کا میں خود بھی قائل ہوں لیکن کیا کروں. یہ دل نگوڑا مانتا

نہیں۔ دل کے ہاتھوں سخت مجبور و بے بس ہوں۔ مجھے اس بات کی بھی حیرت ! و افسوس ہے کہ میرا دلبر جانان میرا امتحان لے رہا ہے۔ کیا اس کے پاس یہ دلیل موجود نہیں کہ میں اُن کی عزت کی خاطر کتنے عظیم بوجھ دل کی گہرائیوں میں سموئے در بدر پھر رہا ہوں)

گرمیوں کا موسم چلچلاتی دھوپ، ننگے پیروں، برہنہ سر، پسینے میں شرابور، سخت پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے اٹکے ہوئے وارد سسرال ہوئے۔ تو محبت و اخلاص کی دیوی، صبر و تشکیب کی مورتی مہر و وفا کے پیکرِ مجسم بیوی۔ اس کو اس حالتِ زار میں دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ زار و قطار رونے لگی تھی اُن کے پاس زبوں حالی شوہر کے لئے چند ایک آنسوؤں کے نذرانے جو اسی وقت اُن کے دامن تار تار میں کچھ اس طرح بکھیر دیئے کہ بے اختیار گدیری لال پکار اٹھے۔

کافر رحم نہ بوئی مسلما نو ثان پو ونیر
آدا تھے آہ نو کو روم آہ کی ادیت زم الویٹر

(مسلمانوں کے اوصاف میں ایک بڑی صفت اُس کی رحمدلی ہے۔ جو آدمی رحم جیسی عظیم دولت سے بے بہرہ ہو وہ کبھی مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا بلکہ وہ کافر ہے۔ میں نے اپنے سینے میں ایک ایسی آگ کو جگہ دی ہے کہ جن کے شعلوں اور شراروں سے ہمیشہ تڑپتا رہتا ہوں۔ باوجود اس مصیبت کے صبر کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ورنہ تو سارے بلند و بالا پہاڑ بھی اِن شعلوں کی زد میں آکر خاکستر ہو جاتے۔)

کافی لمحات گزر جانے کے بعد یہ محبت و ایثار کی پتلی مہر سکوت توڑ کر شوہرِ نامدار کے چہرے سے نظریں اٹھا کر مکان کے دوسرے حصے میں موجود مکینوں کو پانی لانے کے لئے آواز دیتی ہے۔ چند ثانئے گزرے ہوں گے۔ ایک دوشیزہ جس کا حسن کسی زیورِ بے بہا یا بناؤ سنگھار کا محتاج

نہ تھا۔ بغیر سُرمہ کے بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، تپلے تپلے گلابی ہونٹ، چھوٹا سا دہانہ، سفید رنگ جس میں سرخی کی آمیزش جو اس وقت قدرت کی شہکاری کا ایک حسین نمونہ معلوم ہو رہا تھا، ہاتھوں میں پانی کا کٹورہ لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اُس صائقۂ نژاد پر نظر پڑتے ہی شیر ملک کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے اس حسین چہرے کو پہلی بار دیکھا ہو اور زبانِ حال سے یوں گویا ہوئے۔

آدا ھرین لوڑا وا شیشا پو شتیم نقشہ
ع
ہزار بالنملام ہو تم ای شور یار رو موتے بادشا

(اس وقت میں تصورات کی دُنیا میں کچھ ایسا کھویا ہوا ہوں جیسے میں کوئی آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اچانک اسی آئینے پر ایک اور تصویر میری نظروں کے سامنے گزری جس کے چال ڈھال کا نظارہ کرتے ہوئے میں ہزار جان سے اُس پر فدا ہو چکا ویسے تو میری جاہ و حشمت اور شان و شوکت شاہانِ لوم سے کم نہ تھی جب دل میں عشق کی چنگاری اُٹھی تو میرے تخت و تاج مجھ سے چھین لئے گئے۔ ہمیشہ کے لئے میری گردن میں طوقِ غلامی ڈال دیے گئے۔ اب میں بحیثیت ایک زرخرید غلام زندگی کے باقیماندہ ایام نہایت کس مپرسی کی حالت میں گزار رہا ہوں۔)

اُس مستِ ازل کی یہ صدا سُن کر وہ حسین و جمیل پیکرِ انفعال بنی کھڑی رہی۔ نہ زبان سے کوئی لفظ ادا کرنے کی ہمت کی اور نہ ہی وہاں سے ہٹ کر مکان کی دوسری طرف جانے کی طاقت پاؤں میں باقی رہ گئی تھی۔ لال کا خزاں رسیدہ اور نہ گوں حال چہرہ ایک مُرجھائے ہوئے پھول کی طرح نظروں کے سامنے رقص کناں تھا اور یہ بے چاری پتھر کی مورت بنی اُس پر نظریں گاڑ کر اُن کے چہرے سے زمانے کے مترشح نشیب و فراز کا جائزہ لے رہی تھی۔ اتنے میں شیر ملک اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر گنگنانے لگے:۔

تہ عشقو شوبخ مہ ھوستہ شو ثموپے شو تو رکوردم
مہ تران بطنہ نسندہ کو کیڑی مان شکر کوردم ؎

(اگرچہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہوں اور یہ یقین دلاتا ہوں کہ کسی صورت میں بھی تمہارا وصل مجھے میسر نہیں ہوگا۔ آخر دم تک آتشِ عشق میں جلتا رہوں گا۔ پھر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ جس نے تجھے زندہ و سلامت رکھا ہے۔ کیونکہ تمہاری زندگی میرے لئے ایک متاعِ عزیز سے کم نہیں۔ تم میرے لئے ایک انمول خزانے کی حیثیت رکھتی ہو۔)

سیئر ملک کا عشق جنون کی حد کو چھو رہا تھا۔ ایک دفعہ سخت برفباری کے ایام میں کوئے یار کی طرف رختِ سفر باندھا اور ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے گلے اور شکوے کی باتیں اشعار کی شکل میں منظرِ عام پر بھی آجاتے ہیں۔

برارگنیان ثران برارگنیان مہ تہ انو تے نعدہ ہتی شیر
تہ شون غنچہ ریحان بو چھوچی ران وُور ہتی شیر ؎
رویان دُیلیو سورا غیچ مہ سورا چھور ہتی شیر
شکایت پرہ شتی او شوئی نی سن چر سو نور ہتی شیر

(اے میرے اہلِ وطن اور میرے عزیز بھائیو! مجھے ناحق مورد الزام ٹھہراؤ۔ کیونکہ میں پنجابی پر ہوں۔ سچے اور پاک جذبے کے تحت محبت کا سرور انگیز اور فرحت بخش جام نوش کر چکا ہوں۔ اس جذبے سے میرے ہوش و حواس ٹھکانے پر نہیں۔ میں اتنی پی چکا، نہ مجھے اپنی عزت کا کچھ پاس رہا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کا۔ یہ افتاد جب میری جان پر پڑی تب سے میں سب کچھ اُن کے قدموں میں نچھاور کر کے صرف اُن کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر روئے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لب تو اُس کے

ایک کھلے ہوئے ریحان کا پتہ دے رہے ہیں کہ جس کی خوشبوئے خوشربا سے میرے دل کا خزاں رسیدہ چمن پھر سے معطر ہو جاتا ہے۔ یہ خوشبو میرے عشق کی آگ کو اور بھی بھڑکاتی ہے۔ اگرچہ لوگ مجھے ایک دیوانہ سمجھ کر آوازے کستے ہیں اور ساتھ ساتھ سخت نگہبانی بھی ہو رہی ہے لیکن اس زمانے میں سوائے میرے، سچی محبت اور عشق سے کون سرشار ہوا ہے۔ بھنگ اور چرس کے نشے میں مدہوش بلند بانگ دعوے کرنے والے کس کام کے۔ وہ کبھی نہ عاشق ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی ہوئے۔ اُن کا یہ نشہ عارضی اور ناپائیدار ہے)

اپنی لگن میں مست، سردی کا احساس اور نہ ہی برف باری کی پروا۔ اِس دیوانہ حسن نے رات کی تاریکی میں کوئی ایک بجے کا عمل دیارِ یار کی ایک عام سی پو پولو گراؤنڈ میں قدم رکھا۔ سخت سردی ۔ اب مسئلہ شب گزاری کا تھا۔ نیم شب بیت چکی کسی کا دروازہ کھٹکھٹانے کو اُس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی۔ ان سوچوں میں مستغرق، بے اختیار اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں۔

مایو نیئے مو چوڑے کی مہ ٹکیلو نرنگ مو کورے

مہ ژان کی آیتج ریھفیائی تھے تو چوڑے تشنگ مو کورے

(اے مرغِ خوش الحان! خبردار تم اب دیارِ یار میں داخل ہو چکے ہو۔ تمہاری جانِ تمنّا اب نیند کی آغوش میں آرام فرما ہیں۔ تم اپنی صدا کا سحر توڑ۔ اُسے اب مت جگا۔ جب بھی وہ خود جاگ اُٹھے تب بے خوف و خطر اپنی نغمہ سرائی سے اس جہانِ ناپائیدار کو حیرت میں ڈال۔)

اِس شعر پر اکتفا کرتے ہوئے گدیری لال نے کھلے آسمان کے نیچے رات گزارنے کے لئے عزمِ مصمم کر لیا۔ برف کے موٹے موٹے گالے اُس کی میزبانی کے فرائض انجام دینے پر تلے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ کا سرہانہ تخیلات کی دنیا میں کوئی آباد رات اسی طرح آنکھوں میں کاٹی جتی کہ صبحِ کاذب کے آثار نمودار ہوئے۔ راہ گیر اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں۔ دریں اثناء ایک

مسافر کا گذر اس جگہ سے ہوا جہاں شیر ملک ہزاروں ارمان اور حسرتیں دل میں سموئے پڑا تھا۔ راہ گیر کی اس جگہ برف کے تودے دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس کھلی سطح اور ہموار میدان میں یہ ٹیلا کہاں سے آگیا۔ قریب جا کر اس برف کے تودے پر ایک بھرپور لات ماری۔ لات مارنے کی دیر تھی کہ برف کے نیچے اسے ایک کمبل نظر آیا جب کمبل کو پکڑ کر کھینچا تو کمبل کے نیچے ایک انسان صورت خواب شیریں سے بیدار ہوا۔ اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ اچھا یہ برف باری ہو رہی ہے۔ یہ انسانی صورت شیر ملک کے روپ میں راہ گیر کے سامنے حاضر تھی اور مسافر اپنے شناسا لال کو دیکھ کر متعجب ہوا اور پوچھا کیا تو نے اس برف کے تودے کے نیچے رات گذاری؟ کیا اس گاؤں میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں تم آرام سے شب بسر کرتے۔ اور مجھے تعجب اس بات پر کہ تم ساری رات برف کے نیچے کیسے زندہ رہے۔ مسافر کا یہ کہنا تھا کہ گدڑی کا لال ایک آہ سرد کھینچ کر گویا ہوئے۔

پیارے بھائی! میرے سینے میں جو آتشِ خموشاں کی چنگاری اُٹھ رہی ہے اُس کے سامنے برف کے اس ہلکے ہلکے گالوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ آج رات میں تو خیالوں کے سپنے میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا گویا کہ میں دُلہن کی سیج میں پڑا ہوں۔ اور برف کے یہ گالے میری محبوبہ کی طرف سے مجھ پہ پھولوں کے پتے نچھاور کر رہے تھے اور نہایت پُرگداز لہجے میں لب کشائی کی۔

ھائے مہ میرِ ودوبان ادا پھوتو چہ گوسون
بلطنہ جم رمئ نِلی تمثیل کیو کو ردم ژانو۔ سوم
یومونی گیتیِ بوغمدو نو پۃ شیتم گرشیو بوسون
بوسونی کھیو سوم تمثیل گلا بوچہ لکو روزان سوم
بے وفا زمانہ نو، بھی تو وفا کوری لیلی او چہ مجنو نو سوم

(اے لوگو! میں نے تمہیں انصاف کے میزان میں خوب تولا ہے۔ تمہاری نظروں میں میں ایک مُشتِ خاک کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ میرا رونا صرف اس لئے ہے کہ میرے وطن میں کوئی ہستی بھی ایسی نہیں رہی کہ جس کے پاس جا کے غمِ دل اور غمِ فراق کی داستان سُنا سُنا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں یا ذکرِ حبیبؐ سے دل بہلاؤں۔ نہ مجھے سردی کا کوئی احساس ہو رہا ہے۔ اور نہ ہی موسمِ گرما کا۔ کیونکہ میں اپنے عشق میں مگن ہوں سرما اور گرما سے میرا کیا سروکار جس چمن میں بہار نہ ہو۔ وہاں پھول کیسے کھِلتے ہیں اس زمانے کی بے وفائی دیکھ لیلیٰ اور مجنوں جیسے عاشق بھی نامرادی اور ناکامی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور خون کے آنسو بہا کر اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

شیر ملک کے محبوب کی شادی جہاں ہو گئی تھی وہیں اُس کی خوشگوار زندگی گزری۔۔ اور شیر ملک شاید کسی کو اپنے محبوب کا پتہ بھی نہ بتا سکتا۔ اگر لوگوں کی ملامت ساتھ نہ ہوتی اُن کے کلام میں نغمے ہیں اور ایک اشور جان ہے :

رستم خان

رستم خان رستم کا تعلق تحصیل مستوج کی خوب صورت ترین وادی "یارخون" کے ایک گاؤں "اِسپنج" سے ہے۔ ان کی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم نہیں۔ تاہم قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زیارت خان زیرک اور گل اعظم خان گل کے زمانے میں زندہ تھا اور بڑھاپا غالب تھا۔ اس مناسبت سے اندازہ لگتا ہے کہ رستم کی پیدائش انیسویں صدی کے وسط یا پہلے عشرے میں ہوئی تھی۔

رستم خان رستم نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ ہو سکی لیکن اُن کے گیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی زبان و ادب سے باخبر تھے۔

رستم کی شہرت اُن کے اُن مخصوص سبز لہجے اور خاص لَے والے گیتوں کی وجہ سے ہوئی جنہیں مقامی بولی میں "رستم کی دنی" یا "رستم کے ہنگ" کے نام سے جانا جاتا ہے اور جن سے ہر مزاج کا آدمی محظوظ ہوتا ہے۔

"رستمو ہنگ" اس لئے کہتے ہیں کہ ان گیتوں کے گانے کی دھن کسی بھی زبان کے گیتوں میں موجود نہیں ہے اور ان کا گانا ہر مُغنّی کے بس کی بات نہیں۔

لوک گیت کے ماہرین کا خیال ہے کہ "رستم کی دنی" گانے والوں کی تعداد آج چترال میں آٹے میں نمک

کے برابر رہ گئی ہے۔ تاہم سننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

رستم خان کا رومان آج بھی ہر محفل کی زینت ہے اور اُس کے وقت کی طرح اب بھی چرچا باقی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ رستم خان رستم ایک غریب لیکن معزز خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

جونہی اس نے آنکھ کھولی گردوپیش کے ماحول کو پہچاننے لگا۔ ہمعمروں کے ساتھ کھیل کود کے دوران اسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کو اس عالم معصومی میں پیار کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کے ایک ساتھ کھیل کود پر پابندی لگادی گئی اور رستم سے ملنا جلنا بھی بند ہوگیا۔

دونوں ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ اگرچہ وہ ظاہر بین آنکھوں سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے تاہم دل کی آنکھ سوائے اس کے اور کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے ساتھی سے شادی کرے گا مگر تقدیر اس کے برعکس کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ پھر جب رستم کو دوست کا دیدار حرام ہوگیا تو اس نے شادی کا پیغام بھجوا دیا اور اسے اس بات کا یقین بھی تھا کہ لڑکی کے امیر والدین اس غریب کے شادی پہ تیار نہ ہوں گے۔

رستم نے شادی بیاہ کے مروّجہ رسوم وقیود کا لحاظ رکھتے ہوئے محبوب کو حاصل کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن اُسے سوائے ناکامی کے اور کچھ نصیب نہ ہوا۔ اور یہ خبر آئی کہ رستم کے محبوب کی منگنی اُن کے گاؤں سے چند میل دور "بریپ" میں قرار پائی ہے۔ جیسا کہ اساتذہ کا قول ہے کہ عشق خانہ ویران ہے۔ یاور نہ آیا۔ اپنے چند دوستوں کے پاس گیا جو رستم کے حال کی خبر رکھتے تھے۔ دوستوں نے اس کی تصدیق کی کہ اس کا محبوب بھی

اس کی پریشانی سے آگاہ ہے چنانچہ امید کی ایک کرن ہنوز موجود رہی۔ اُمید کی اس کرن کے ساتھ رستم نے محبوب کو کہلا بھیجا کہ

ای مشہر تو وُ ٹشکارہ ای مغرب و ٹشکارہ اُو ٹشک گان گویان

ہر دی جہل کو یان " قالب تھان دو یان

مہ وُ چ تہ محبت تُسی تو نیستائے نصیب جہل کوری موڑ تو کھا نج لو یان

اے محبوب! مشرق و مغرب دونوں طرف سے سُنتا ہوں کہ ناامیدی کی خبر گرم ہے۔ اور مخالف ہوائیں چل رہی ہیں۔ اگرچہ یہ ناکامی یقینی ہو گئی ہے پھر بھی وحشی دل تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور ضد پر تُلا ہوا ہے۔ چونکہ جسم جو کہ دل کا غلام ہے چار و ناچار جدھر کھینچے سرِ تسلیم خم ہے۔

اے محبوب! تیری اور میری محبت کبھی ختم نہیں ہونے والی ہے لیکن نصیب کی مخالفت پہ ہمارا کوئی بس نہیں چلتا جو اپنی دشمنی اور ضد کی بنا پر دیوار کی طرح بیچ میں حائل ہو گیا ہے۔

صبا نے اس کی آواز محبوب تک پہنچائی نہیں لیکن وہ اپنی جگہ بے قرار رہا اور نصیب کے اس اہم فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران محبوب کی شادی کا وقت آن پہنچا۔ رسم و رواج کے مطابق دُولہا اور اُن کے بزرگ و اقارب، دوست و احباب بارات لے کر محبوب کے گاؤں میں آن داخل ہوئے اور یوں محبوب کے رخصت ہونے میں ایک دن سے بھی کم کا عرصہ رہ گیا۔ محبوب چونکہ پہلے ہی ناخوش تھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا گیا۔ اُس کے غموں میں شدت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ مسلسل کئی دنوں سے محبوب کے روتے اور غمگین رہنے کی خبر رستم تک پہنچ گئی۔

تُو میان ثریا تو یونس

تہ کیڑے ویشتیان کیہ ناموس

تہ بلادر اُشرو ڈیل دیاؤ مُوخو گونیان چھوئے اُفُوس

اے دوست! تیرا مقام ثریا سے بھی ارفع ہے۔ تمہیں دیدۂ تر کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے۔ جو کسی بھی لحاظ سے آبرو مندانہ نہیں ہے۔

سُنتا ہوں کہ شب و روز آپ کے چاند جیسے چہرے پہ ہجومِ اشک ہے جو کسی قدر موتیوں سے کم نہیں ہے)

قاصدِ عشق نے رستم کا یہ پیغام بھی پہنچایا۔ رات گزری، صبح ہوئی محبوب کی روانگی کے لوازمات پورے ہو گئے۔ بارات جانے کی تیاری میں مصروف، محبوب کی حالت نا دیدنی ہو گئی۔ اُبلتے چشموں کی طرح اشک ریز۔ سرو جیسا نازک قد صورتِ مئے خوردہ لڑکھڑاتا۔ رخصتی نہیں گویا تختۂ دار کے لئے لے جایا جا رہا ہو۔ خویش و اقارب اور سہیلیاں، ہجومِ غم سے دو چار، رخصت کرنے کی تیاری میں مصروف۔ قصہ مختصر رخصت کرنے والوں میں سوائے اس اسپِ تازی کے جو دُلہن کی سواری کے لئے آراستہ و پیراستہ اپنی نافہمی کی وجہ سے ہنہنا رہا تھا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس دل گداز منظر سے متاثر نہ ہُوا ہو۔

اُدھر رستم کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ قریب کے ایک ٹیلے میں بیٹھا دو دلوں کی ہمیشہ کی جدائی کا یہ جگر سوز منظر دیکھ رہا تھا۔

جب غم و عشق کا یہ قافلہ برات کی صورت میں رخصتی کی رسم سے فارغ ہوا تو رستم کی آواز اس ٹیلے سے اُبھر رہی تھی۔

وفادار روبان تین روئے آرند و کونیان
بے وفاودیان تین ہزار تھو کونیان

ای خوش دورک روئے جدائیو آنوس جارہ کوئی نو توری رئے اُشرو کونیان

اے محبوب! باوفا لوگوں کی پوری دنیا متمنی ہوتی ہے اور بے وفا لوگوں

کو سب نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔)

دیکھئے! محبّت کا انجام! ایک دوسرے سے محبّت کرنے والے جُدائی کے وقت مجبور و بے بس ہو کر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ (جن پہ ان کا بس چلتا ہے) اور بس۔

پہلی بار محبوب کو دیکھ کر دل دے بیٹھنے کا ذکر کرتے ہوئے رستم نے دوسرا گیت گایا جس کے بول یہ ہیں:۔

تُوصفتِ گُلنار تُو حور انن مُوژار تہ اول پوشیکہ دِل من پریشان صدافسوس

تہ دون دُرِ مکنونِ نفیرُوز

تن شٹیلی غیچھیسن خَب لوٹھے بہ دُشٹکی ہفت اتلیمو سوراہفت کشور تہ کورے

بیک روز

اے محبوب! تو حُور کی نسل سے ہے اور خُلد میں جلوہ افروز۔ پہلی بار جب تجھ پر نظر پڑی تو آج تک دل کو قرار نہ ملا۔ کفِ افسوس ملتا رہا ہوں۔

(اس کے بعد محبوب کے دانتوں کی چمک کو دُرِّ مکنون سے تشبیہہ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تیرے دانت دُرِّ مکنون اور فیروزے کی طرح چمکدار ہیں۔

(تُو اپنی محبّت بھری نظروں سے ایک بار میری طرف دیکھ۔ مجھے یُوں لگے گا گویا ہفت اقلیم کی شہنشاہی مجھے مل گئی ہے) اس کے بعد اپنی بے قراری اور پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے رستم نے کہا:۔

دوست جان چھیبینہ بنفشو شربت لکھی تیر مہ گو نہ پیتک نکی ریم

تہ گدیریو ہردی تمانداامیزان گان کوریکو مُرینگوڑ تھئنگ نکی ریم

میرے محبوب کی مثال جام میں بھری شربت بنفشہ کی سی ہے جو مرے سامنے رکھی ہوئی ہے لیکن پینا ممنوع ہے۔

دوسرے بند میں اپنے دل کی بیقراری کو ہوا زدہ ترازو کے میزان سے تشبیہہ دیتے ہیں۔
جو ہمیشہ ہوا لگنے کی وجہ سے ہلتا رہتا ہے اور قرار نہیں پاتا۔ مطلب یہ ہے۔ اب کے بعد
دل کی بے قراری مقدر بن گئی ہے اور دل کا قرار عنقا ہو گیا۔
کہتے ہیں کہ رستم نے اس ٹپلے سے ایسے پُرسوز انداز سے گایا کہ بارات والے پریشان ہو گئے
بہرحال بارات دُولہا کے گھر روانہ ہوئی لیکن اس کے بعد ملامت کی لہر جاری ہوئی اور جس نے
رستم کے زخم خوردہ دل پہ نمک پاشی کا کام کیا۔

داہنِ ہر بت پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی　　　عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

رستم کی ملامت کی زنجیر رسوائی عدم تک پہنچ گئی اور یوں رستم اس ملامت سے بہت
زیادہ تنگ آیا۔
ملامت سے بچنے کی تدبیر سوچی اور نصیبے کو ذمہ دار ٹھہرا کر خود کو ملامت سے بچانے کی
کوشش کی۔ چنانچہ رستم نے کہا:

مُلامتو کا نو کمبوخ بو یونی
کمبوخ بو کی ہوتی تینتان در رینو یوئی
بخت پویرو کمبخت ماتین رینو یوئی

ملامت کے درخت کی شاخیں بے شمار ہوتی ہیں۔ ایسے میں شاخوں
کو چھانٹا جاتا ہے یعنی ملامت کی تطہیر کی جاتی ہے۔
(اے لوگو! مجھے ملامت کس لئے کرتے ہو۔ اگر ملامت کرنی ہے تو میرے برے
نصیبے کی کرو۔ جو واحد چیز تھی کہ مانع ہوئی۔ ورنہ محبوب ہاتھ لگ گیا ہوتا)
یوں رستم نے اس ملامت سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔ رستم کی آئندہ زندگی کی تصویر
قریب قریب صاف ہو گئی۔ اب محبوب پر کیا بیتی؟

کہتے ہیں کہ محبوب خستہ و رنجور رہنے لگا

ازل سے ساس بہو کی نہیں بنتی محبوب اس دوسرے غم سے بھی دوچار ہوا۔ ساس نے جب بہو کو غمگین اور سوچ میں ڈوبا ہوا پایا تو ساس اور بہو کے تعلقات خراب ہونا شروع ہو گئے تعلقات کی یہ خرابی روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ محبوب جو پہلے ہی بارِ غم تلے دبا تھا۔ مزید دبتا گیا محبوب کا فگار دل پارہ پارہ ہوتا گیا اور یوں اُن کی زندگی رستم کی نسبت زیادہ تلخ ہو گئی محبوب کی اس تلخ زندگانی اور ساس کے خراب تعلقات کی خبر رستم کو پہنچی تو بے چارے رستم کے پاس سوائے بددعا کے اور کیا چارہ ہو سکتا تھا چنانچہ رستم نے پیرزن کے حق میں دعائے بد کے لئے ہاتھ پھیلایا۔

جلاد واؤ غش کو یان مرژنگ تھینو سُوم

کوچھو ہون گنیا لار تور رابھینو سُوم

سُنتا ہوں کہ بڑھیا (ساس) میرے محبوب کے ساتھ ہمہ وقت آمادۂ پیکار ہے

(جن کے قد کے آگے سرو خم تھا) میری دعا ہے کہ خدا اُس کی ساس کا خانہ خراب کرے)

اس دوران اگرچہ وصلِ یار جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ محبوب نے رستم کا حال معلوم کرنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ جونہی یہ پیغام رستم تک پہنچا تو رستم نے یہ گیت گایا۔

تو میاں ثریا تہ غیس نو بوئے

ملامتو دنیا مگم نان تہ پشیم کوس وِیشٹین نو بوئے

تُو ثریا کی سہیلیوں میں سے ہے (ثریا سات ستاروں کی سہیلی) اور تیرا مقام بہت ہی اونچا ہے۔ ایسی نسبت سے تیرا نام کسی دوسرے کے سامنے لیا نہیں جاسکتا۔ یعنی قاصد کے ذریعے خواہ وہ صبا ہی کیوں نہ ہو، اپنا حال بیان نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کہیں دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میرا حال جو پہلے سے ملامت کا ہدف بنا ہوا ہے۔ دوسرے فریق کے ذریعے بیان کرنے اور پہنچانے میں اور بھی

خراب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ دُنیا ملامت پہ کمربستہ ہے۔

اگر ممکن ہوا تو خود آکر دیدار اور پرسشِ حال کی کوئی تدبیر تلاش کروں گا۔ لیکن کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا خلافِ مصلحت ہے۔ قاصد خواہ کوئی بھی ہو۔ راز راز نہیں رہتا)

لیکن بتایا جاتا ہے کہ حالات ایسے ناموافق ہوئے کہ رستم کے لئے دوست کا دیدار ناممکن ہوا اور یوں قاصد کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔ لیکن محبوب کو تسلی دینے یا اپنے احوال سے کسی نہ کسی طرح ناگزیر تھا۔ چنانچہ رستم کے پاس گیت کے پیغام کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اپنے احوال کی تصویر ذیل کے گیت میں رستم نے کچھ اس طرح کھینچی ہے:

ماہی خشک بے آب سے دریا ہوت کی ہائے البتہ اے مہ دوست

مہ مثال بتیر

مہ جم روئے مہ نسہ اہی دربت کی نشتی تن شیریں الفاظیس مہ سوم ٹوکی دتیر

پھت بسومہ عمر ہزار سال بتیر

(شاید ہی ماہیٔ بے آب کی مثال مجھ جیسی ہو۔ لیکن یہ بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اگر میرا محبوب چند لمحوں کے لئے بھی میرے پاس بیٹھے اور اپنے مخصوص اندازِ شیریں سے ہم کلام ہو۔ تو آدھے دن کی میری زندگی ہزار سال کی زندگی کے برابر ہو جائے۔)

مہینے وصل کی گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں

لیکن گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

حاکم چپاڑی فرمان اکبر خان کے فرزندِ ارجمند رحمت اکبر خان رحمت جنہیں کھوار زبان وادب سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ اپنے والدِ محترم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ امیر منزہ سفارت کی غرض سے چترال آئے اور کچھ عرصہ چپاڑی میں حاکم موصوف کے ہاں قیام پذیر ہوئے اُنہیں موسیقی اور لوک گیت سے بے حد لگاؤ تھا۔

چاپاڑی میں اُن کے قیام کے دوران روزانہ محفلِ موسیقی ترتیب دی جایا کرتی تھی۔ چنانچہ رستم کو جو اس دوران شبابِ عشق کے دور سے گزر رہے تھے اور اُن کے گیتوں کا گھر گھر چرچا ہو رہا تھا محفل میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ چاپاڑی رستم کے گاؤں سے لگ بھگ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور علاقے کے انتہائی حسین اور خوب صورت ترین گاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ رستم بزمِ موسیقی کے میرِ مجلس ہوئے اور فرمائش پر اپنے گانے شروع کئے رحمت صاحب کے بقول جو اپنے والد صاحب کے حوالے سے کہتے ہیں۔ رستم نے ایسے سوز و ساز سے گایا کہ میر مُہنزہ سے رہا نہ گیا اور وہ بے اختیار رو پڑے۔

رحمت صاحب کے بقول میرِ مُہنزہ نے کہا خدا کی قسم! "اگر یہ شخص میری بیٹی پر عاشق ہوتا تو میں بلاچون وچرا اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر لیتا۔" کتنا ظالم ہے وہ شخص جس نے رستم کے حال پر ترس نہ کھایا۔

اب رستم بڑھاپے کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ ایک طرف "خانہ ویران ساز" عشق کا روز افزوں غم، دوسری طرف غمِ پیری وضعف القصہ رستم بیک وقت دو غموں کے بوجھ تلے دبتا ہے۔ بارِ غمِ عشق جن کے دوشِ جوانی متحمّل نہیں تھے بہرحال بخوشی سہتا ہے اب بھلا بوڑھے کاندھے اس کے کیسے متحمّل ہو سکتے ہیں۔ رستم کو بھی اس غم کے ناقابلِ برداشت ہونے کا احساس ہوا۔ اپنے ایک گیت میں وہ عشق اور کارنامۂ عشق کی کش مکش کو خونخوار شیرنی کے مقابلے میں تشبیہہ دے کر فرماتے ہیں:

فلک ہوستہ شیکہ کورہ ترچ شیران سوم رو برہ بیکو

فلک پرائے مہ سوری موشں زارو بیکو

شیر کی نسبت شیرنی زیادہ تند خو اور خونخوار ہوتی ہے) رستم جانی اور عشق کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے عشق کو خونخوار شیرنی سے تشبیہہ دیتے ہیں اور فرماتے

ہیں۔ عالم شباب میں دل تُند خو شیرنی (عشق) سے مقابلہ کرنے کی آرزو مندانہ جرأت رکھتا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ تُند مزاج شیرنی (عشق) بڑھتی جاتی ہے اور جوانی جواب دینے لگی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بوڑھے کاندھوں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جو ناقابل برداشت ہے۔ اس کے بعد اپنی جوانی کو شیر سے اور بڑھاپے میں داخلے کے دَور کو بھیڑیئے سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں۔

اول شیر اوشو تم نیسن گُرگ ہو تم

عالم شباب میں جرأت و ہمت کے لحاظ سے میری مثال شیر کی تھی جو کسی بھی خطرے کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اور اب میری مثال ایک گرگ (بھیڑیئے) کی سی رہ گئی ہے جس کا کام چوری چھپے چھاپہ مارنا ہے جو بُزدلی کی علامت ہے۔

اسی گیت کے دوسرے بند میں عالم جوانی کو "عاشق" سے اور حالیہ آغاز دورِ پیری کو بزرگی سے (جس کے دو معنی ہیں) تشبیہہ دیتے ہیں مقامی بولی میں لفظ "بزرگ" خدا رسیدہ آدمی کی بابت استعمال ہوتا ہے چونکہ رستم جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے فارسی زبان وادب سے بھی آگہی رکھتے تھے فارسی میں بھی قریب قریب خدا رسیدہ اور عمر رسیدہ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ رستم دوسرے بند میں فرماتے ہیں:

نست عاشق اوشو تم موشٹس بزرگ ہو تم

(آغازِ عشق میں، میں بطورِ عاشق کے متعارف ہوا تھا۔ اور اب ایک بزرگ خدا رسیدہ ہوں جو عشق ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے)۔ اسی گیت کے تیسرے بند میں اپنے عشق کی ناکامی اور وصلِ یار سے محرومی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ناشکری ار تیام تہ سار خور ہو تم

یقیناً یہ ہجرِ دوام کسی نہ کسی دانستہ یا نادانستہ ناشکری اور غلطی کا نتیجہ

ہو گا جس کی سزا میں کاٹ رہا ہوں۔ اس کے بعد رستم کی انتہائی پیری کا زمانہ آتا ہے
اور رستم ضعف و ناتوانی کے ہاتھوں نڈھال ہے)

جوانی ہالہ گشت از چرخِ پیرش
بسانِ شیر شد موئے چو قیرش

اُن کے سر کے لمبے اور سیاہ بال جو کبھی قیر سے سبقت لے جاتے تھے دُودھ کی طرح سفید ہو گئے۔ سرو جیسا قد خمیدہ، سر آگے کو جھکا ہوا، کھوئی ہوئی جوانی کا متلاشی، چہرے کا رنگ پریدہ، صفتِ برگ سیب زرد، معشوقہ باز آنکھیں جوں گورِ بخیلِ تنگ اور اندر کو دھنسی ہوئی بے عصا برخاستن حرام، گھٹنوں سر زانو پہ، دن کو جو کبھی ایک دفعہ سر اٹھاتا تو آہ سرد از دل پر درد

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

ایسے میں رستم کی مزاج پرسی کے لئے غمخواروں کی ٹولی حاضرِ خدمت ہوتی ہے۔ رستم اپنے احوال کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

یُور یُور وا نوتِ کی ہائے گوئے حمائونین
کَیا اَبشار گینمیان مہ حوالسونیین

(کہتے ہیں کہ دن کی لمبائی جب اپنے کمال کو پہنچ کر گھٹنا شروع ہو تو مقامی طور پر دھوپ کی گرمی تیز تر ہو جاتی ہے میری مثال ایسی ہے جوانی کے دن جتنے گھٹتے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جوں جوں بڑھاپا غالب آتا جاتا ہے ساتھ ساتھ عشق کی آگ اور بھڑکتی ہے۔ حالانکہ اسے بھی کم ہونا چاہیئے تھا)

جب صورتِ حال ایسی ہو تو میرا کیا پوچھنا! کہ تم کیسے ہو؟

گیت کے تیسرے بند میں اپنی پوری زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

قیامتو آنوس فرشتہ ضامن بوئے مہ ہُوا لوتین

روزِ جزا جب میری اور قسمت لکھنے والے فرشتے کی پیشی خدا کے حضور ہوگی تو اسی وقت میری اس بے بس اور قابلِ رحم زندگی کی تمام تر ذمہ داری اُس فرشتے پر ہوگی جس نے میری تقدیر لکھی اور خداوند تعالیٰ اُن سے پوچھیں گے، جو رحیم ہے کہ اتنی بڑی تقدیر کیوں لکھی ؟ تو فرشتہ خود جواب دہ ہوگا۔ یہ کہا اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

اے چرخِ فلک خرابی از کینۂ تست	بیدادگری شیوۂ دیرینۂ تست
اے خاک اگر سینۂ تو بشگافند	بس گوہرِ قیمتی کہ در سینۂ تست

بیگاں

چترال سے تین میل شمال کی طرف چترال کے دو بڑے دریا مستوج اور لوٹکوہ ایک سنگلاخ پہاڑی چٹان کے دونوں جانب سے آکر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ بغل گیر ہوتے ہیں۔ دریائے مستوج جاہ و جلال کے ساتھ یہاں تک پہنچتا ہے جبکہ دریائے لوٹکوہ نہایت نرم لہجے میں کسی دردناک المیے کو اپنی زبان میں بیان کرتا محسوس ہوتا ہے۔

بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

شاید اس کی سسکیوں میں چترال کے جنگجو بہادر دانیال بیگ کی حسرتناک موت کی داستان اور یورمس بیگم کے تینوں بھائیوں کا بہتا ہوا لہو سنائی دیتا ہے۔ مگر یہ داستان بیان کرنے کے لئے اس کی زبان گنگ ہے۔ شاید یہ دریا یہ پہاڑ یہ بوڑھا آسمان بھی راز کو راز ہی رکھتے ہیں۔ اگر ایک صدی گزرنے کے بعد بھی یہ دُرِّ پنہاں صدف کے سینے میں مستور نہ ہوگا تو صدیوں پہلے کے حقائق آج کے افسانے بننے کی بجائے داستانیں بن جاتے۔

بیگال شغور کا باشندہ تھا جو چترال سے پندرہ میل دور گرم چشمے کے راستے پر واقع ہے سنگِ مرمر کے فلک بوس پہاڑوں سے گزر کر چاروں طرف سے گھری ہوئی یہ تنگ وادی اپنی

قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے شہرت کی حامل ہے۔

بیگال اس تنگ وادی میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا اور پولو کا بہترین کھلاڑی تھا۔ پولو چترال کا قومی کھیل ہے پولو پرانے زمانے کے بہادر نوجوانوں کی جنگی مشق بھی تھا۔ چترال کی مختلف وادیوں میں پولو کے بڑے بڑے میدان تاریخی پس منظر کے حامل ہیں پولو کے میدان کو چترالی زبان میں "جنالی" کہتے ہیں جو کہ جولانی کا مخرب ہے۔ بیگال اپنے زمانے کے پولو کے کھلاڑیوں میں یکتائے زمانہ تھا جس کا نام آج بھی پولو کی تاریخ میں زندہ ہے۔

بیگال مقابلے کے مختلف کھیلوں میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کر کے گلگت، پونیال، غذر کی ٹیموں سے مقابلہ جیت لیتا اور اپنے زمانے کے حکمرانوں کا نام روشن کرتا۔

نوروز کے موقع پہ دنیا کے مختلف حصوں میں جشنِ نوروز منائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس روز عالم آفتاب دنیا کے بارہ برج میں دورہ کرتا ہوا برج حمل کے پہلے درجہ پہ آتا ہے تو یہ وقت جشنِ نَوروز منانے والوں کے لئے بڑا متبرک ہوتا ہے۔ اُسی دن چترال کے بالائی علاقوں میں نَوروز کی خوشیاں منائی جاتی ہیں جس کو مقامی زبان میں "پتھک" کہتے ہیں۔

کابل میں بابر نے اسی روز چٹان کھود کر ایک تالاب بنوایا۔ اس چٹانی تالاب پہ اس نے یہ شعر کندہ کروایا ؎

نَوروز نو بہار مئے و دلبرے خوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آج کا دن بھی نَوروز کی خوشیوں کا دن تھا "شنوہ" کے "ڈرنو جُنالی" میں پولو کا بندوبست کرایا گیا تھا۔ مہتر کی ٹیم اور بیگال کی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ بیگال کو ہی جیت جانا تھا اور جیت بھی گیا۔ کھیل ختم ہوا۔ مہتر اپنے قلعے میں پہنچا۔ بہت تھک چکا تھا بستر پہ آرام کیا۔ مہتر کی ملکہ نے طنز کی۔ ایک بوئی اُچھے کھیل کا مظاہرہ تو بیگال نے کیا۔ ہمارا مہتر ویسے ہی تھک جاتا ہے"۔ اس طنز کا مہتر پہ

برا اثر ہوا۔ دوسرے دن بیگال کے ساتھ گھڑ دوڑ کے مقابلے کا چیلنج دے دیا۔ راتوں رات جنالی کے ایک حصے میں خندق کھدوایا اور اس کے اوپر بید کی باریک باریک شاخیں ڈال کر مٹی سے ڈھانپ دیا تاکہ گھڑ دوڑ کے مقابلے کے دوران بیگال کا گھوڑا خندق میں گر کر بیگال سمیت ہلاک ہو جائے۔ مگر وقت آنے پر بیگال کے گھوڑے نے خندق کے کنارے پہنچ کر جست لگائی۔ اپنے سوار کو بچایا دوسری بار دوڑ ہوئی تو گھوڑا دوسری بار بھی جست لگا کر بچ نکلا اور تیسری بار بھی چھلانگ لگا کر بیگال کو ناکام ہونے نہ دیا۔ تو مہتر مجبور ہوا۔ تیسرے دن پھر پولو میچ کا پروگرام کیا گیا۔ آج رات مہتر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ راتوں رات بیگال کو قتل کر دیا جائے۔

سورج کی شعاعیں جنگلی بوٹیوں پر پڑی ہوئی شبنم کے قطروں کو ہوا میں تبدیل کرتی گئیں مُت بیگم نے اپنی ساس سے کہہ دیا" بیگال آج دیر تک سو یا رہا کیا میں اس کو جگا دوں "؟ تو ساس نے بہو کو ایسا کرنے سے منع کر دیا اور بولی "میرا بیٹا کل کھیلتے ہوئے تھک گیا ہے، دیر تک اس کو سونے دو"۔ سورج کی شعاعیں تیز ہوتی گئیں۔ سُرخ رنگ کے جنگلی گلاب زرد رنگ کے خوشبودار پھولوں سے ہمجولی ہو کر مرغزاروں کو معطر کرتے گئے مُت بیگم پریشان سی ہو گئی۔ بیگال کا گھوڑا اس کے انتظار میں ہنہنانے لگا۔ گھر کے ستون میں لٹکا ہوا بیگال کا تازیانہ مُت بیگم کی دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ ملنے لگا۔ مُت بیگم تیزی سے بیگال کے سرہانے جا پہنچی۔ بیگال کو آواز دی لیکن جواب نہ ملا۔ اس نے اپنی زندگی کے ساتھی کو موت کی آغوش میں پایا۔ مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور غشی طاری ہو گئی۔ ماں بھی پہنچ گئی۔ بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ شفقتِ مادری کے چند قطرے آنسو کے گرائے۔ بہو کو تسلی دی بیٹے کی لاش کو اسی طرح بستر پر لٹا دیا۔

دن ڈھل گیا دور "ڈیر وجنالی" میں لوگوں کا جمگھٹا نظر آرہا ہے۔ ڈھول اور شہنائی بکھر رہی تھی سب تماشائی جولانی میں پہنچ چکے تھے۔ مہتر اپنے گھوڑے پر سوار زیرِ لب مسکرا رہا ہے اور ڈینگیں مار رہا ہے کہ آج کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔

دُور سے ایک نوجوان گھوڑا دوڑاتا ہوا آرہا ہے۔ گھوڑا تو تیزی سے دوڑتا ہوا جولانی کی طرف آرہا ہے شاید یہ دیر سے آنے کی وجہ سے گھوڑے کو تیز دوڑا رہا ہے۔

"یہ گھوڑا تو بیگال ہی ہے"۔ مہتر کے دل میں شک اُبھرا۔ سوار قریب آتا گیا۔ اندازہ بھی وہی ہے شک یقین میں تبدیل ہوگیا۔ شاید قاتلوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ مجھے دھوکا دیتے ہوئے مجھ سے کب بچ سکتے ہیں۔ بیگال کو زندہ چھوڑ کر وہ کیوں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ ایسا بالکل نہیں ہوسکتا۔ شاید انہوں نے غلط فہمی سے کسی دوسرے کو قتل کرڈالا ہوگا بیگال جولانی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہی شکل وصورت، سر پہ وہی جنگی خود۔ یہ تو وہی بیگال ہے۔ مہتر بہت نادم ہوا۔ کہ اس کا منصوبہ آج بھی ناکام ہوا۔ کھیل شروع ہوا۔ بیگال کو جیت جانا تھا جیت گیا۔ سستانے کے مہتر سمیت تمام کھلاڑی بڑے چنار کے درخت کے سائے میں چبوترے پر آگئے۔ مہتر بیٹھ گیا اور تمام کھلاڑی باادب دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ بیگال نے ایک قدم آگے جاکر سر کو جنبش دی۔ سر سے خود گر گیا۔ لمبے لمبے سفید بال غمگین چہرے پریشان ہوگئے۔ مہتر حیرت زدہ ہوا۔ تو وہ بولی اس گیند کو ایک بوڑھی عورت بھی ٹھوکر مار سکتی ہے۔ میرے بچے کو تم نے کیوں قتل کرڈالا۔ وہ نہایت غمگین آواز میں بولی

مہتر و بے رحمیو لو ہائے نو بیگال
زخمی مہ ہر دیو لو ہائے نو بیگال

(ہائے ہائے میرا بیگال! مہتر کی بے رحمی اور اپنی بوڑھی ماں کے زخمی دل کو دیکھ کہ مجھ پہ کیا گزر رہی ہے)

چھیو تہ مری لو غدوہائے نو بیگال
لٹے یزوجاری ببر وہائے نو بیگال

(ہائے ہائے میرے بیگال! راتوں رات تجھے قتل کرکے چل دیئے اور خون کی دھاریں...

تمہارے سینے پہ جاری ہو گئیں ۔)

تہ استوری زِندری بھچیتائی ہائے ننو بیگال

تہ چاغیز ژینگی بھچیتائی ہائے ننو بیگال

(تمہارا گھوڑا تمہارے انتظار میں ہنہناتے رہ گیا اور تمہارا چابک تمہارے انتظار میں ہلتا رہ گیا)

تہ یاران غاڑہ دبغانی ہائے ننو بیگال

تہ مریکو صیبت کوہانی ہائے ننو بیگال

(تمہارے ساتھی کھیل کے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھ پر یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ یہ لوگ تیرے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے)

دارنہ دیکو پونگہ ہاڑ ہائے ننو بیگال

کرا کوئے تہ غونہ غاڑ ہائے ننو بیگال

(اگر تو جولانی کے ایک سرے پہ گیند کو ٹھوکر مارے تو دوسرے سرے تک جا پہنچے اور گول ہو جائے۔ کون ہے وہ جو تمہارے مقابلے میں کھیل کے میدان میں آسکے)

تہ ٹمبوق پھو رینین گیا ور ہائے ننو بیگال

آسمانو چھوئنیں گیا ور ہائے ننو بیگال

(ہائے میرا بیگال! اگر تو گیند کو ہوا میں اچھال کر ضرب لگائے تو گیند بہت بلندی پہ چلی جائے اور یہ گیند آسمان سے باتیں کرے)

یار بوتر یکو یار پھتوکی ہائے ننو بیگال

بیگال نو ہائے تعاڑ پھتوکی ہائے ننو بیگال

(ہائے میرا بیگال! کھلاڑی ترتیب دیتے وقت ایک کھلاڑی کی کمی ہے
اس کمی سے مراد یہ ہے کہ پورا کھیل بے لطف ہے کیونکہ اس کھیل میں بیگال
جیسا کھلاڑی شامل نہیں ہے)

یہ مینار تہ کوم ریبائے ہائے ننو بیگال
ے
پُرتہ ینجو دیکو واؤدی بتیائے ہائے ننو بیگال

(ہائے میرا بیگال! اس مہتر نے تجھے کیوں قتل کر ڈالا جب ایک
بڑھیا بھی پولو کھیل سکتی ہے)

تہ ننو جگر بریاں ہائے ننو بیگال
ے
یہ مہترو کیہ زیاں ہائے ننو بیگال

(تمہاری امی کا جگر پارہ پارہ ہوگیا۔ اور مہتر کو کچھ بھی احساس نہیں ہے)

مُت بیگمو مُت جمہ ہائے ننو بیگال
ے
مہ بیگالو زاسمہ ہائے ننو بیگال

(مُت بیگم کے ہار موتی کے ہیں اور میرے بیگال کی وردی زریں تھی)

لوٹک تہ لوٹاؤ گونیاں ہائے ننو بیگال
ے
اُچی سف کیرٹاؤ بنیاں ہائے ننو بیگال

(ہائے میرے بیگال! آج پولو کے میدان میں سب تماشائی تمہارا کھیل
دیکھنے آئے تھے کھیل ختم ہونے پر سب روتے ہوئے واپس ہو رہے ہیں)

حوران تہ تے پروشٹ گونیاں ہائے ننو بیگال
ے
ای الغو سار جیت گونیاں ہائے ننو بیگال

(بہشت کی حوریں تمہیں لینے کے لئے آرہی ہیں۔ وہ حوریں جو ایک سے ایک بڑھ کر

خوبصورت ہیں)

مہ غموژ کا پیشیر ہائے نَنو بیگال
تہ بدبو خلائی گنیر ہائے نَنو بیگال ؎

(ہائے میرا بیگال! میرا بدلہ اِن ظالموں سے خدائے جبار لے گا۔ اس وقت میرے غم کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔)

بیگال کا یہ لوک گیت آج بھی جولانی کے میدان میں ڈھول اور شہنائی پہ بجایا جاتا ہے اس واقعے کا مہتر پہ بڑا اثر ہوا۔ بوڑھی عورت نے اپنے بیٹے کی تجہیز و تکفین کی۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد علاقہ غذر کے مہتر نے چترال کے مہتر کو پولو میچ کا چیلنج دیا۔ اس زبردست مقابلے میں مہتر چترال کو بری طرح شکست ہوئی جبکہ بیگال کی زندگی میں مہتر چترال کی ٹیم کو ایک بار بھی شکست نہ ہوئی تھی۔ آج مہتر بہت نادم ہو کر بیگال کی قبر پہ گیا اور بیگال کی روح سے معافی مانگی۔ تو غصے کے مارے بیگال کی قبر پھٹ گئی اور زبانِ حال سے بولی

وا فقا در زندگانی قدر ما نہ شناختی
بعد مُردن در پائے تابوت نالیدن چہ سُود ؎

لوک ڑور

قدرت کی حسین و جمیل رعنائیوں کی آماجگاہ دیدہ زیب اور پرکشش نظاروں کی سرزمین وادی چترال جس طرح سیاحوں کے لیے جاذب نظر ہے اسی طرح اس علاقے میں بسنے والے لوگ بھی اپنے اخلاق، تہذیب اور شرافت سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ اس علاقے میں قدم رکھنے والا ہر فرد جس طرح اس وادی کی خوب صورتیوں سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح اس علاقے کے باسیوں کے حسن و اخلاق کا گرویدہ ہوتا ہے۔

اہل چترال کی تہذیب و تمدن، لوک کہانیاں، لوک گیت اور لوک رقص ملک کے دوسرے حصے کے لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہ لوک کہانیاں اور گیت صدیوں سے سینہ بہ سینہ محفوظ چلے آرہے ہیں۔ اب بھی جب کبھی نوجوانوں کی کسی محفل میں کوئی بزرگ ان کہانیوں کے کسی باب کو چھیڑتا ہے تو رومان پرور داستانیں حسن بکھیر دیتی ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ ایک بار گاؤں آتے۔ ان کا حسب نسب مستوج کے گاؤں چنار سے تھا اور چنار کی "لوک ژور" وادی کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ ہم نے انہیں کہانی سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے بہ اصرار یہ کہانی سنائی۔ انہوں نے کہا کہ یہ صدیوں پرانی داستان ہے جو سینہ بہ سینہ سفر کرتی اب تک اسی آن بان سے

سنی سُنائی جا رہی ہے۔ اُنہوں نے کہانی شروع کی :-

علاقہ مستوج کے چنار نامی گاؤں میں میاں بیوی رہتے تھے جن کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام تُوک اور چھوٹی کا بُوک تھا۔ قریب کے ایک گاؤں میں اُن کے والد کا ایک دوست رہتا تھا۔ بہت پہلے اُن میں یہ طے پایا تھا کہ جب ایک دوست کے ہاں لڑکا ہو جائے اور دوسرے کے ہاں لڑکی تو دونوں کا رشتہ کر دیں گے۔ چترال کی قدیم روایات کے تحت یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ اسے قبائلی زندگی میں بیرونی دشمنوں کے بیرونی اور اندرونی مخالفوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرنے کی غرض سے انتہائی اہم کام تصور کیا جاتا تھا۔

تُوک کی عمر نو سال تھی اور بُوک نے ابھی سات بہاریں دیکھی تھیں۔ انہی دنوں ان کے ہاں دوست کے لڑکے کا رشتہ آیا۔ اور والد نے اپنی بڑی لڑکی تُوک کی منگنی اس لڑکے کے ساتھ کر دی۔ بارات کے آنے کا دن بھی مقرر ہوا۔ نیوتہ کے لئے گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو گھر گھر جا کر کافی تعداد میں دُلہن کے گھر جمع کیا گیا۔ اور تمام ننھے مہمانوں کے سامنے "اِشپیری" لا کے رکھ دی گئی۔ اُسی روز صبح سویرے رشتہ داروں اور احباب کے پاس "ڈاک دویُو" بھیج دیئے گئے تھے۔ دوپہر کے بعد وہ لوگ بھی پہنچنا شروع ہو گئے۔ اِدھر لڑکی کی ماں نے آس پاس کی خواتین کو بُلا لیا تھا۔

دُلہن بن کے سُسرال جانے والی تُوک کی سہیلیاں بھی اپنی اپنی پسند کی چیزیں اکٹھا کر رہی ہیں سورج ڈھلنے سے پہلے گاؤں کے سب مرد اور عورتیں اور تُوک کی بہت سی سہیلیوں نے بہت سے تحفے تحائف دلہن کے گھر لا کر ڈھیر کر دیئے۔ بارات ٹھہرانے کے لئے بڑی حویلی سجائی گئی۔

دوسری طرف لوک والا کے دوست احباب بارات کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے ابھی سورج نے اپنا سفر طے نہیں کیا تھا اور شام کے چہرے پہ روشنی کی لکیریں باقی تھیں کہ بارات دروازے پہ آن پہنچی۔

لوگ حسبِ مراتب ایک دوسرے کے پیچھے بڑے دروازے سے باہر نکل کر سامنے کھیتوں کی

پگڈنڈیوں تک براتیوں کے استقبال کو گئے۔ مہمانوں کے پیچھے دو تین گھوڑے سوار بھی آ پہنچے۔

حویلی کے باہر مہمانوں کے خیر مقدم اور تعارف کے بعد پہلے سے اُن کے لئے آراستہ کئے مکان میں ہر طرف کو مناسب جگہوں پر بیٹھا دیا گیا۔ نکاح خواں آئے۔ مذہبی عقیدے کے مطابق نکاح پڑھا گیا۔ مجلس میں موجود تمام شرکاء ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے رہے۔ اس موقع پر اکثر باراتی دلہن کے خاندان کے کئی بڑوں کی عزت و احترام اور رواجی آداب بجا لانے میں مصروف تھے۔

مہمانوں کے ہاتھ دھلانے کے لئے ایک کروے میں نیم گرم پانی لایا گیا۔ اوٹ مہرکہ" میں اول بڑے بزرگوں اور معززین کے ہاتھ دھلوانے کا کام شروع ہو گیا۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ پنیری روٹیوں کے ساتھ پنیر اور "پتیخ" (لکڑی کی بنی ہوئی خرادی ڈونگوں) میں خالص دودھ میں بنی ہوئی کھیر بطور "شپیری" پیش کی گئی نیز کھیر کھانے کو ہر مہمان کے آگے "کپھینی" لکڑی کے ہی چمچے بھی رکھے گئے۔

ادھر زنان خانے میں لوک کی سہیلیاں اپنی ہمجولی لوک کے بناؤ سنگار میں مصروف تھیں۔ شام کے تھوڑی دیر بعد گاؤں کی خواتین نے بھی کھانا کھا لیا۔ بڑی بوڑھیاں نے لوک کی شادی کے جوڑے پر دم کرکے اُسے پہنا دیا۔ اس کے بعد باہر سے آئی ہوئی خواتین اور لوک کی تمام سہیلیاں ایک ایک ہو کر اپنے خاندان والوں کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ گھر میں اب لوک کی امی، بھائی اور بلوک کے علاوہ چند رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہیں رہا تھا۔

نہ جانے آج رات خلافِ معمول نئی نویلی دلہن کو اتنی جلدی نیند کیوں آ رہی تھی۔ لوک کو اونگھتے دیکھ کر اُس کی ماں نے اُسے سو جانے کے لئے کہا۔ کیونکہ صبح سویرے انہیں بہت دور جانے کی تیاری بھی کرنی تھی۔ ماتی کے اصرار پر بدقت تمام سٹور روم کے پاس پہنچ گئی ہے اور اس کی ماں دوسرے ادھورے کام کرنے میں مصروف ہو گئی۔ گھر کے دوسرے افراد بھی گزشتہ دو دنوں سے رات گئے تک کاموں میں مصروف رہ کر بے حد تھک چکے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے اپنی اپنی خوابگاہوں میں

چلے گئے. گھر میں صرف لوک کی امّی ہی جاگ رہی تھی رات آدھی گزر چکی تھی چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا گاؤں کے کنارے اٹھکیلیاں اور بل کھاتی ہوئی ندی نالوں اور دریا کی روانی کے مسحور کن آواز کے سوا باقی ساری فضا خاموش تھی. ہر سو خاموشی. سٹور روم کے پاس برآمدے میں لوک اپنے پلنگ پر بیٹھی نیند سو رہی تھی. اُس کی امّی اُس کمرے سے جہاں وہ شام سے بیٹھی کام کر رہی تھی. باہر نکلی ہلکے بادلوں کی اوٹ سے چاندنی کی روشنی ہر طرف نکھری ہوئی تھی جو تتلیوں کی صورت برآمدے کی جالیوں سے ہو کر سوئی ہوئی لوک پر روشنیوں کے رنگ برنگے پھول نچھاور کر رہی تھی. کافی دیر سے لوک کا بے حس پڑا رہنا اُس کی ماں کو کچھ عجیب سا لگا. اِس خیال کے آتے ہی تیز تیز قدموں سے ماں لوک کے پلنگ کے قریب آ پہنچی. لوک کے سرہانے بیٹھ کر نہایت احتیاط سے اوپر کی ہوئی شال ہٹائی چند لمحے تک پیار بھری نظروں سے ماں لوک کے چہرے کو تکتی رہی. پھر لوک کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اُس کا سر ہلایا اور دھیمی آواز سے اُسے پکارا. مگر لوک بالکل بے حس پڑی تھی. سانس لینے تک کی آواز نہیں رہی تھی. ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ایک شک یقین میں بدلنے لگا. سینے اور شہ رگ پہ ہاتھ رکھ کر نبض کی حرکت معلوم کرنا چاہی. دل کی حرکت اور نبضیں خاموش تھیں. اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا. اس کے پاؤں لڑکھڑائے. اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی لوک ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو چکی غموں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے۔

لوک تو قدرت کی مہربانیوں سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائی تھی اور ابھی میکے سے سسرال تک جانے کی آرزو بھی پوری نہ کی تھی رات اس کی ماں کے لئے ہزاروں غموں کا پیغام لے کے آئی. اور اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی چلتے چلتے تھم گئی ہو. لمحہ بہ لمحہ عجیب سی گھٹن کا سا احساس بڑھنے لگا تھا اُسے یوں لگا جیسے اُس کی آرزو مر گئی ہو کہ لوک اس کی سب سے بڑی آرزو تھی . . . . . اس کی سب سے پہلی تمنا۔

کچھ دیر تو اُسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے. اس کے لئے یہ اذیت ناک لمحات تھے. تصور بھی نہیں

کر سکتی تھی کہ اس کے دروازے سے بارات خالی واپس چلی جائے گی۔

وہ دل ہی دل میں صبر کی دعائیں مانگنے لگی اور پھر بجھے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ روشنی کی ہلکی سی کرن جو اس کے دل میں پھوٹی تھی وہ پلک جھپکنے میں ڈوب گئی۔ وہ ٹوک کے باپ کے کمرے میں آئی اور اس اچانک آنے والی مصیبت سے اُسے آگاہ کیا۔ اس دلخراش اور اندوہناک واقعہ کی اطلاع پا کر ہر ایک نڈھال ہو گیا۔ ٹوک کی بے وقت موت سے گھر کا سارا ماحول ہی بدل گیا۔ اِک کہرام مچا خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی۔ اور پورا خاندان ماتم کدہ بن گیا۔ لیکن اس صدمے پر کھل کر آنسو بہانے اور دُکھ کا اظہار کرنے میں بارات مانع تھی خسر کی مرضی و منشا کے آگے چھوٹے بڑے گھر کے تمام افراد نے سرِ تسلیم خم کر دیئے اور گھر والوں نے دیر تک غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ بارات کو خالی ہاتھ نہ بھیجا جائے۔ اور ٹوک کی جگہ بلوک کو دُلہن بنا کر بھیج دیا جائے گا۔

رات شکل سے ڈھل گئی۔ تو پہ سحر کے ہوتے ہی پرندوں نے اپنے گھونسلوں سے سرگوشیاں چھیڑ دیں مگر اُن کی چہک میں پہلے والا وہ میٹھا رس دل لبھانے والا وہ مزہ اور مدہوش کرنے والی وہ مستی نہیں تھی۔ کوئل کا انداز بھی بدلا بدلا سا تھا۔ سورج کی کرنیں ماند پڑ گئی تھیں ایک مدھم سی روشنی لے کر پاس کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے دامنِ کوہ کی طرف پھیل رہا تھا۔

وداع کہنے والی ٹوک کی دُکھی ماں اور غمزدہ باپ حسبِ فیصلہ مہمانوں کے ناشتے کی تیاری میں لگ گئے لیکن ان کے سامنے اپنے غم کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ مہمانوں نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا اور واپسی کی تیاری کرنے لگے۔

آخر کار رخصتی کا وقت آیا تو بلوک کو ٹوک کی جگہ دلہن بنا کر اس کا ہاتھ اُس کے دُلہا کے ہاتھ میں دے کر رخصت کر دیا گیا۔

چند لمحوں کے لئے ہلکی ہلکی بارش کے بعد ہر چیز نکھری نکھری ہوئی تھی۔ براتی خوش خوش

قطار در قطار ہرے ہرے کھیتوں کے وسط میں پیدل راہ چلتے، بنفشے چُنتے آگے آگے رواں تھے ہلکی ہوا کے جھونکے پھولوں کو چھُو کے جاتے تو پھول شرما کے سر جھکا لیتے۔ درختوں پتیاں بجا بجا کر بلوک کی برات کی خوشی مناسے تھے فضا ہر سمت میں معطر تھی۔ مگر بلوک کی ماں اندوہناک واقعے کا شکار ہوئی جس کی مثال دنیا میں شاید ہی مل سکے۔ نوک کا معصوم بھولا بھالا چہرہ اس کے ذہن میں آموجود ہوتا اور وہ تڑپ جاتی۔

اُدھر اپنے سُسر کا ہاتھ تھامے جاتے ہوئے بلوک مڑ مڑ کر دیکھتی تو ایک نئی آگ ماں کے سینے میں روشن ہو جاتی۔ وہ سوچتی ننھی بلوک کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کم سنی میں اپنی گڑیوں سے جدا ہو کر اتنی جلدی دُور بہت دُور ایک دوسرے خاندان کے انجانے لوگوں کی بہو بن جائے گی۔

اِدھر غم کی ماری رنجیدہ ماں دل تھامے ہاتھ ملتی دیوانہ وار اپنے مکان کی چھت پر چڑھ گئی اور نوک کی بے وقت موت کا ماتم کرنے لگی جو داغ مفارقت دے گئی تھی اور ساتھ ہی بلوک بھی کو سول دور اپنے سُسرال روانہ ہو کر چند ہی منٹوں بعد آنکھوں سے اوجھل ہونے ہی والی تھی۔ رہ رہ کر بلوک کا ادھورا جملہ جو کہ ابھی اس کے دُودھ کے دانت بھی پورے نہیں نکلے تھے۔ ماں کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ "نان مہ شیرین نان .... مہ بو خوش اِسپُسا ر نوک کورا اسور...... مہ ہمونی راغیشتی کو انگہنیا وُ .... نان مہ اوراردو......"

کہ ماں پیاری ماں ...... میری اچھی باجی نوک کہاں ہیں ...... مجھے اتنی سویرے کیوں جگا رہی ہو ماں۔ امّی مجھے نیند آ رہی ہے ......

دل اس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ بلوک کی امّی ماممتا کے جوش میں دل کے ہاتھوں بہت ہی مجبور ہو کر، دُکھی ماں کی آواز گونجنے لگی:-

نانو شیرین نان ریتائے — ماں کی پیاری ننھی دُلاری
نوک بہتی نوک شبوک — نوک مری دلہن ہے بلوک

نان غیرومان ژړانو

تیری امی تجھ پہ واری

مہ ژوړئے نانئے غیرومان
ښانئے ژړیے بپ
نان غیرومان ژړانو

میری بیٹی ماں تیری جان کے صدقے
سمدھی آگئے اور براتی
اس کے پیچھے چلتے ہیں
ماں کے دل میں تیرے
مستقبل کے دیپ جلتے ہیں
تیری امیّ تجھ پہ واری

مہ ژوړئے نانئے غیرومان ژړانو
مہ ژوړوړه چپان تیل دیور
نان غیرومان ژړانو

میری بیٹی ماں تیری جان کے صدقے
اے لوگو تم سب
اس دلہن کے بال سنوارو
تیری امیّ تجھ پہ واری

مہ ژوړئے نانئے غیرومان ژړانو
مہ ژوړوپروښنٹ دویو ژیرپور
نان غیرومان ژړانو

میری بیٹی، ماں تیری جان کے صدقے
ننھی دلاری کے براتیو
تم سب ایک قطار بنا کے چلو
تیری امیّ تجھ پہ واری

مہ ژوړئے نانئے غیرومان ژړانو

میری بیٹی ماں تیری جان کے صدقے

تان موشو ہوستو تن گنے
نان غیرِ ومان ژ انو

خاوندکا تم ہاتھ پکڑ کے
جیون کی راہوں پہ چلنا
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ شُو رئے نانئے غیرِ ومان ژانو
قُلفین صندوقو تن گنے
نان غیرِ ومان ژ انو

میری بیٹی ماں تیری جاں کے صدقے
لے جاؤ صندوق مُقفل
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ شُو رئے نانئے غیرِ ومان ژ انو
پھیک پھیک بیلیِ موکیرٹے
نان غیرِ ومان ژ انو

میری بیٹی ماں تیری جاں کے صدقے
ننھی جان کبھی نہ رونا، اور چُپ رہنا
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ شُو رئے گوڑو تے نانئے غیرِ ومان ژ انو
بسانہ نودی نزاؤ سان
نان غیرِ ومان ژ انو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
جا بھی رہی ہو، تم نے دیس پیا ہے کہ نہ
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ شُو رئے گوڑو تے نانئے غیرِ ومان ژ انو
کہ بسا ہی خدائے تہ یار
نان غیرِ ومان ژ انو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
اگر دیس پیا کو جانا ہے

دیکھو آگے پیاری بیٹی
جاؤ تیرا اللہ بیلی
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ تُورئے گوڑوتے نانۓ غیرومان تزانو
چھوئے بچھوئے سامونان کو نیان
نان غیرومان تزانو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
شب بھر میں تیرے سامان کی تیاری
تُو دلہن بن کر دیس پیا کے جانے والی
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ تُورے گوڑوتے نانۓ غیرومان تزانو
سنگِ تاب یہ ہردی و کیچہ تھسُوران
نان غیرومان تزانو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
تیری جدائی کی تپش سے بیتاب
اس دلِ بیقرار کو کیسے تسکین ہو
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ تُورئے گوڑوتے نانۓ غیرومان تزانو
مُوتر دیہ موڑین رشیوران
نان غیرومان تزانو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
گاؤں کا وسطی حصّہ دیکھو
تیری جدائی میں بے چین

جیسے میرے دُکھیا ہنس
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ ژُورے گوڈمتے نائے غیرومان ژانو
برار کو پور نیک بغائے
نان غیرومان ژانو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
تیرا اکلوتا بھیا سسرال تک
تیرے ہمراہی ہو کے چلا
تیری امّی تجھ پہ واری

مہ ژُورے گوروتے نائے غیرومان ژانو
ہوستنیٹری ہوستو نن ترا ٹگوؤ
نان غیرومان ژانو

ننھّی دلاری تم پہ ماں قربان
تیری جان کے صدقے
اپنے گھر کی ہو کے رہنا
تیرے پیا کا گھر ہے تیرا
تجھ کو ہو وہ گھر ہی مبارک
جہاں کہ تم کو رہنا ہے
جو کچھ بھی ہو سہنا ہے
تیری امّی تجھ پہ واری

بُلوک کی رخصتی سے ایک گھر ماتم کناں ہوا تھا لیکن اس ایک گھر کا نوحہ ایک داستان بن کر آج بھی صدیوں سالوں سے چترال کا لوک ورثہ بنا ہوا ہے۔ آج بھی جب شادی بیاہ کے موقعہ پر نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ٹولیاں بنا کر اس گیت کو سُناتے ہیں تو یُوں لگتا ہے جیسے کُھلے بالوں والی ماں کوٹھے کی چھت پر چڑھی اپنی بیٹی کی رخصتی کا گیت گا رہی ہے :-

ڈوک سخید یہ

بارھویں صدی عیسوی میں چترال کے بالائی حصے پر "سُومَلِک" نامی خاندان حکومت کرتا تھا جس کی حکمرانی گلگت کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ سومَلِک کا دارالحکومت "دراسن" دکمھوہ تھا۔ گلگت اور انواع کے قلعوں کی حفاظت اور اندرونی بیرونی خلفشار روکنے کے لئے ہر سال چترال کے نوجوان منتخب کرکے بھیجے جاتے جو اپنی مدت پوری کرکے لوٹ آتے۔ انتخاب ہر قوم اور قبیلے کے نوجوان سے کیا جاتا۔ اور باری باری اس کے لئے ہر شخص کو جانا پڑتا تھا۔

علاقہ کھوت جو "تورکھو" کے شمال کی طرف سطح سمندر سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے جس کی مشرقی بلندی پر گاؤں بخدیر واقع ہے جہاں لال اور کائی کے رومان نے سر اُبھارا ہے۔

لال ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اوئل بچپن میں ہی اس کے والدین کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس کا چچا اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ اور وہیں لال نے پرورش پائی۔ چچا اور چچی نے اسے کبھی محرومی یا یتیمی کا احساس تک نہ ہونے دیا اور وہ بھی چچا چچی کو ماں اور باپ کی طرح سمجھتا تھا۔

غزالہ اس کے چچا کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ مراد اور غزالہ کی پیدائش ایک ہی دن ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی ان کا مشغلہ ایک دوسرے کو تکتے رہنا تھا جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو مراد غزالہ

کو "کائی" کے نام سے پکارتا۔ اور غزالہ مراد کو "لال" کہا کرتی تھی۔ "لال" کے معنی معزز مرد اور کائی سے مراد حیادار خاتون ہے۔ غزالہ اور مراد اپنے گاؤں میں "لال" اور "کائی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ لال اور کائی کی محبت بڑھتے بڑھتے جنون کی حد تک جا پہنچی مگر پھر بھی انہوں نے اپنی محبت کو کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

چترال کے سرحدی علاقوں میں لوگوں کے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک نشیبی علاقوں میں، جہاں وہ موسم سرما گزارتے ہیں، اور دوسرا پہاڑی چراگاہوں میں، جہاں موسم گرما میں مال مویشیوں سمیت جا کے رہتے ہیں۔ لال مال مویشیوں کے ساتھ پہاڑی گھر میں رہتا تھا۔ اور کائی نشیبی گھر میں چنانچہ ایک دوسرے سے دوری دونوں کی راتیں چاٹ جاتی۔ نشیبی گھر سے ہفتے میں ایک یا دو بار لال کو روزینہ پہنچانے آتی۔ اس بار جب چچی آئی تو اس نے لال کو کائی کی شادی کی خبر سنائی۔ تو لال بے چین ہو گیا۔ اس نے وارفتگی کے عالم میں چچی سے کہا۔ آپ دو مہینوں سے میرے لئے خوراک لا رہی ہیں۔ مگر میں نے ابھی تک ایک نوالہ بھی نہیں لیا۔ لیکن میرا دل کھانے پینے سے اُٹھ گیا ہے۔ اور اب آپ اس کی شادی کی خبر دے رہی ہیں۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ کائی کے بغیر میں ایک سانس بھی کیسے لے سکوں گا۔ کائی کی جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گی۔ پیاری ماں! آپ سمجھ لیں کہ یہ میری زندگی کے آخری دن ہیں۔ آپ کائی کی شادی کی خوشیوں کے دن گزارنے کے بعد میری موت کی خبر بھی سُن لینا۔ لیکن میری پیاری ماں اس وقت تک کسی سے بھی بات نہ کرنا۔ تاکہ کائی کی خوشیوں میں خلل نہ پڑے۔"

لال کی باتوں کا چچی پر اثر ہوا۔ چچی نے لال کو بچوں کی طرح پالا تھا۔ اور اس کے ساتھ بڑی محبت کرتی تھی چنانچہ وہ منت سماجت کر کے لال کو ساتھ لے کر نشیبی گھر آ گئی اور اس کو تسلی دی کہ خدا سب کچھ درست کرے گا۔

آدھی رات کو جب گاؤں کی گلیاں اندھیروں میں منہ چھپائے سو چکی تھیں، چچی نے لال اور

کاٹی دونوں کو ایک ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت دے۔ اور لال کاٹی کو ساتھ لے کر راتوں رات گھر سے روانہ ہوگیا۔ اُدھر مشرقی افق سے ماہتاب عالمتاب اپنے انتہائی جوبن پہ رات کو برف سے ڈھکی سفید چوٹیوں پہ طلوع ہوا۔ ادھر لال سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ کوئی حسین خواب تو نہیں۔ یہ غزالہ ہے یا کوئی حور؟ کہیں یہ سب کچھ سپنا تو نہیں۔

لال! جلدی جلدی قدم اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمارے پیچھے آجائیں۔"

"نہیں کاٹی! اب تم میری ہو کوئی پیچھے آ بھی جائے تو کیا ہوگا۔"

لال اور کاٹی ایک اُجڑے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ وہ گھر ہے جس میں لال پیدا ہوا تھا۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد آج تک لال نے اپنے گھر کی خبر نہیں لی تھی۔ اب سالوں سے اُجڑے ہوئے گھر سے ایک بار پھر نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔

دوسری طرف لال اور کاٹی کی گمشدگی نے کہرام مچا دیا۔ سارا گھر ویران پڑا تھا۔ بارات ڈھول تاشوں کے ساتھ آئی اور غم کے گیت گاتی واپس چلی گئی۔ اور گھر کی ویرانیاں بڑھ گئیں اور دوسری طرف لال اور کاٹی رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا اضداد سے بنائی گئی ہے۔ دن اور رات، پھول اور کانٹے، بہار اور خزاں، سفید اور سیاہ، خوشی اور غم لازم و ملزوم ہیں۔ لال اور کاٹی کی چند روزہ خوشیوں کو بھی دوام حاصل نہ ہو سکا۔ شادی کے چند دنوں کے بعد ہی گلگت میں قلعے کی رکھوالی جن چند نوجوانوں کے حصے میں آئی ان میں لال بھی تھا۔ کاٹی کے آنسوؤں میں ڈوب کر لال گلگت کی طرف روانہ ہوا۔ لال کی زندگی میں کاٹی کے علاوہ اس کے گھوڑے کومیت اور شہباز بھی شامل تھے۔ جب لال اپنے کومیت گھوڑے پر سوار ہوا تو کاٹی نے اس کے شہباز کو آزاد کر دیا۔ اور بولی کہ میں نے اس قیدی پرندے کو آزاد کر دیا۔ تاکہ میرا لال بخیر و عافیت واپس وطن لوٹ آئے۔

وقت گزرتا گیا۔ لمحہ لمحہ انتظار کی گھڑیاں بنتی گئیں۔ گردش گردوں لمحوں کو گھنٹوں میں، گھنٹوں کو

دن رات میں تبدیل کرتی گئی۔ دن ہفتوں، پھر مہینوں میں بدل کر سال کے سال بھی پورے ہو گئے قلعے کی رکھوالی پر گئے ہوئے نوجوان دروں، بیابانوں، دشت و صحراؤں کو عبور کر تے علاقہ کھوت کب کے لوٹ چکے تھے۔ مگر کائی کی قسمت کا درخشندہ ستارہ لال وہیں کہیں ڈوب گیا تھا۔ آج نہ صرف کائی بلکہ کھوت کی ندیاں بڑے بڑے نالے وسیع و عریض سرسبز میدان، لہلہاتی کھیتیاں، نشیب و فراز پہاڑیاں چہچہاتے پرندے ٹمٹماتے چراغ، تھرتھراتے پروانے، رنگ برنگی تتلیاں نوشگفتہ گل، بلبل و قمریاں، فضا اور ہوا سب ماتم کناں تھے۔ وہ کونسی آنکھ تھی جو پُرنم نہ تھی، وہ کونسا دل تھا جو فراق لال میں غمگین نہ تھا۔

لال کی گمشدگی کو کئی سال گزر گئے۔ کائی نے لال کے انتظار میں روتے روتے آنسو خشک کر لئے۔

لال سا موژان کوری ویرشگوموت بغلائے

تہ نن گو روم کوری کا یو عمر بغائے

میرا لال سفر کی تیاریاں کر کے علاقہ "ویرشگوم" (گلگت میں وہ علاقہ جہاں قلعہ موجود تھا) کی طرف روانہ ہوا۔ اور مدید کے انتظار میں میری عمر ختم ہو گئی۔

کائی کو اس بات پر سخت افسوس ہوا کہ میں اگر لال کے پیارے شہباز کو اپنے پاس رکھ لیتی تو کم از کم یہ لال کی طرف سے تو ہوتا۔ کہتی ہے

تہ یور جو دریغاں تے دریت

تہ یور جو دا غا چھو چھو

میں نے تیرے شہباز کو جنگلی درندوں کے نذر کر دی۔ آج تیرے شہباز کی یاد میں رو رو کر میں نے آنکھوں کے دریا خشک کر لئے۔

نہ تن گورودم کوری تن حالاری بخت

نہ تن غیچ کوری لال تن غیچاری بخت

تمہارے فراق میں سوچ سوچ کر میری حالت نمزار ہو گئی۔ اور تمہاری راہیں تکتے تکتے میری آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی۔

لال اور کائی کی شادی نے جس نوجوان دولہے کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نوجوان نے دوبارہ پیغام بھیجا۔ لال کی گمشدگی کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ والدین راضی ہو گئے۔ اب کائی پر مصیبت کا دوسرا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شادی کے دن مقرر کئے گئے۔ لال کے انتظار کے بیقرار دن گزرتے گئے اور آرزوئیں مچل مچل کر مجبوری کے ہاتھوں خاموش ہوتی گئیں۔ ایک طرف اگر موہوم سی اُمیدیں پیدا ہوتیں تو دوسری طرف یاس کی تاریکیاں چھا جاتیں۔ متواتر کئی سال کی بیقراریوں، بیتابیوں اور نا امیدیوں کے بعد کائی ایک دن اپنے گھر کی چھت پر بیٹھی اپنے کپڑے سی رہی تھی۔ کائی کی غزالی آنکھوں سے موتی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ نہایت غمگین اور سُریلی لَے میں گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں سوز، گریہ اور نا امیدی تھی ؎

تن نصیبوت کیڑیم نصیب کیچہ بیرائے

مہ مقصود د کورے مرلوٹ نیمی خدائے

مَیں اپنی قسمت پر گریاں ہوں کہ مَیں کتنی بدقسمت ہوں۔ اے میرے عظیم خُدا! تو میری مدد کر ؎

ارماں بریکوتے ہوئے زندگیا رہ بیزار

موکورے اے اللہ مہ بزیاروت اِشکار

اَب تو موت کی تمنّا ہے اور زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ اے اللہ! تُو مجھے اس عقاب کے پنجے میں شکار نہ بنا ؎

ہمی روم کیر کوٹ بارلن اوہ موش بغر جاشوم

تان موشو سارا جی اوہ موش نو اٹوم

مَیں ان جنگلی اور وحشی انسانوں کو مَردوں میں شمار نہیں کر سکتی مَیں اپنے خاوند کے بعد دوسری شادی ہرگز نہیں کروں گی۔

اُدھر گلگت کے ایک غار میں ایک مریض میلے سے کمبل میں لپٹا بیٹھا ہوا تھا اور غار کے قریب گاؤں سے ایک بوڑھا شخص روزانہ لکڑی کی پیالی میں دودھ ڈال کر خدا کے نام پر دے جاتا ہے آج بھی حسبِ معمول بوڑھے نے دودھ لا کر رکھ دیا اور واپس ہوا۔ یہ لال تھا جو سوچ میں مگن ایک طرف جذام جیسے خطرناک مرض میں مبتلا، دوسری طرف آرزوؤں، مرادوں اور تمناؤں کی ماحصل "گائی" سے ہمیشہ کی جدائی۔ اے

"اے خدا! مَیں وطن سے دُور بہت دُور غریب الوطن مسافر ہوں۔ آج مَیں جذام جیسے مرض میں مبتلا ہوں۔ نہ صرف مجھے اپنی خوب صورت جوانی پر ناز تھا بلکہ میرے وطن کے دوسرے لوگ بھی مجھ پر رشک کرتے تھے۔ آج میں کس مپرسی کی حالت میں دوسروں کا محتاج ہوں۔ جان لیوا مرض نے میری شکل وصورت بگاڑ دی۔ جو اب پیاری "کائی" سے جدائی کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور اب تو گھر والوں کو بھی میری موت کا یقین آ گیا ہوگا۔ ایسی حالت میں زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا؟" لال ان خیالات میں محو تھا کہ اچانک ایک سوراخ سے سانپ نمودار ہو گیا۔ اور لکڑی کی پیالی میں دودھ کو چاٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ زہر آلود دودھ چھوڑ کر سانپ واپس اپنے بل میں گھس گیا۔ اُس وقت لال نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ لال چرخ کج رفتار کی ستم ظریفی سے تنگ آچکا تھا۔ موقعے کو غنیمت جان کر لال نے زہر بھرا دودھ پی لیا۔ زندگی اور مرگ خدا کے ہاتھ میں ہیں خدا کو لال کی حالت پر رحم آیا۔ اور "کائی" کی دعاؤں کو مستجاب کر دیا۔ زہر نے تریاق کا کام کیا۔ خدا نے لال کو نئی زندگی بخشی۔ ڈیڑھ دو مہینے میں لال بالکل تندرست

ہو گیا۔ لال کا گھوڑا گلگت کے قلعے کے اصطبل سالوں سے لال کے انتظار میں ہنہنا رہا تھا۔ لال قلعے میں آیا اور گھوڑے کو تیار کر کے اپنے آبائی وطن کی طرف روانہ ہوا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد "بارخون" کے "دیزگ" نامی گاؤں میں رات گزار کر کھوت آن" کی چڑھائی سر کر کے جب کھوت کی چراگاہ میں داخل ہوا تو کھوت کے سرحدی حدود کے چھوٹے چھوٹے پیہ ندے رنگ برنگے خودرو پھول سرسبز پہاڑیاں اور جگہ جگہ دراڑوں میں جمے ہوئے برف کے تودے کچھ آگے جا کر مخملیں گھاسوں میں سے بہتے ہوئے شفاف پانی کے نالے لال کو خوش آمدید کہنے لگے۔ لال کہیں سرسبز گھاس اور کہیں ریتلی میدان کو طے کرتے ہوئے ایک ندی کو چار بار عبور کر کے اپنے گھر کے نظارے کو دیکھنے ہی والا تھا۔ اُدھر اپنے کوٹھے کے چھت پر بیٹھ کر کائی اپنی غمگین لے میں گا رہی تھی ؎

کیڑ یمان چھوئی انوس تہ آرمنہ چھو چھو

اشرو غیچہ چھو چھو لئے بدا نہ چھو چھو

تیرے وصل کے انتظار میں شب و روز رو رو کر پانی خشک ہو گیا۔ آنسو تو آنکھوں میں خشک ہوئے اور آنسوؤں کے ساتھ خون بہتے بہتے بدن میں خشک ہو گیا۔

کل برات کے جانے کا پروگرام ہے گھر میں شادی بیاہ کے انتظامات پورے ہو گئے ہیں سسرال والے گھر کے پیچھے چمن میں مخملیں گھاس پر مختلف قسم کے قالین بچھائے بیٹھے ہیں سسرال والوں کے ساتھ گاؤں والے بھی مدعو ہیں۔ گھر میں "اسپیری" کا بندوبست ہو رہا ہے اور گاؤں سے سسرال والوں کے لئے "مری" لائے جا رہے ہیں۔ مگر کائی اکیلی کوٹھے کی چھت پر مغموم بیٹھی بچشم تر مسیحا کے متلاشی ہے۔

کائی کی دعائیں، ایک دردناک اور غمگین نغمے کی صورت میں زبان سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔

"کائی کے گرتے ہوئے آنسوؤں کو بارگاہِ ایزدی میں بارِ قبولیت حاصل ہوئی۔ دور بہت دور ایک سوار نظر آیا۔ یہ سوار درہ کھوت آن کی طرف سے آرہا تھا۔ کائی کے دل میں اُمید کی جو کرن تھی اور انہونی خیالات کے بل بوتے کائی کی نظریں ہمیشہ کھوت آن کے راستے میں ٹکی ہوئی ہوتیں آج اُسی راستے سے یہ نووارد آرہا تھا، قریب آتا جارہا ہے۔ کائی اپنے انداز میں کہتی ہے۔ ے

اِستور لالوا ستور۔ سور و موش کو کرا؟

گھوڑا تو اُسی لال کا گھوڑا ہے معلوم نہیں کہ سوار کون ہے؟

کائی گاتی رہی نغمے فضا کو سوز بخش کرتے رہے۔ اس کی نظریں سوار پر مرکوز رہیں۔

ڈوک شوڑو دیتی تن استور و اویری

بخدیز ڈوکوتے گوئے بخدیز ڈوکوتے گوئے

"ڈوک شوڑہ کو" یعنی اس ریگستان کو طے کر کے اپنے گھوڑے پر سوار "بخدیز ڈوک" کی طرف ضرور آئیگا

سوار قریب پہنچ گیا۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

کوٹھے کی چھت سے "کائی" نے چھلانگ لگائی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اس کا لال اس کے سامنے تھا۔ لال نے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی بغل گیر ہوئے بچھڑے ہوئے پھر مل گئے اور کل کو جانے والی برات ایک بار پھر بےنیل و مرام لوٹ رہی تھی ۔:

فردوس شٹہپوری

ہر کھوار بولنے والا شخص کھوار کے مشہور گیت شہ بھوری سے واقف ہے۔ اس رومانی گیت کا تعلق اس داستان سے ہے جس پر عشق ہمیشہ نازاں رہے گا۔

اس واقعہ کا تعلق چترال کے حسین ترین گاؤں جنجور سے ہے۔ شہ بھوری اسی گاؤں کی ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ پردوم شاہ المعروف میرنہ فردوس فردوسی بھی اسی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔

آج سے تقریباً اسی سال قبل بابا فردوس محکمۂ صحت میں بطورِ ویکسینیٹر ملازم تھا۔ اس کے فرائض میں گاؤں گاؤں گھوم کر بچوں کو چیچک کا ٹیکہ لگانا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ہی گاؤں جنجور میں تھا۔ بچے حسبِ معمول اس کی آمد پر بھاگنے لگے۔ مائیں بچوں کو پکارتے ہوئے اُن کے پیچھے تھیں بڑی مشکل سے اُن کو بہلا پھسلا کر لائیں اور ٹیکے لگانے کا عمل شروع ہوا۔ یہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ ہر طرف بچوں کے رونے کی آوازیں اور والدین کے پکارنے سے ایک شور بپا تھا جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی پردوں سے جھانک کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اسی دوران بابا فردوس کی نظر ایک دروازے پر کھڑی حسینہ پر پڑی اور بابا فردوس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ کام سے فارغ ہو کر بابا گھر آیا تو اس کا دل اور خیال وہیں رہ گئے تھے۔ والدین

اس کی پریشانی اور خلاف معمول خاموشی سے متفکر ہوئے لیکن بابا نے دل کی بات نہ کہی۔ ایک تجسس اس کے اندر پیدا ہوا۔ آخر یہ پری زاد کون تھی جس کی ایک نظر نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ بمشکل تمام وہ اس خاتون کے بارے میں معلوم کر سکا۔ مگر اب اس پر پہلے سے زیادہ اذیت اُتر آئی تھی وہ خاتون پہلے سے شادی شدہ تھی۔

اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ کسی طریقے سے اپنی محبوبہ کو حاصل کرے یا اس غم کو بھول جائے لیکن یہ غم ایسا نہ تھا جسے بھلانا آسان ہو۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی محبوبہ کو حاصل کرے گا کیونکہ اب محبوبہ کو حاصل کرنا اس کا مقصدِ حیات بن گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بابا فردوس کا عشق بھی بامِ عروج پر جا پہنچا۔ اس کی بیقراری حد سے بڑھ گئی۔ دن میں ایک دفعہ محبوب کا دیدار اس کے لیے لازم ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر دن گزرتے تھے نہ رات کٹتی تھی۔ عشق کی آگ اُس کے محبوب شتہ پھوری تک جا پہنچی لیکن پھوری مجبور تھی وہ اپنے عشق کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی۔ شادی کی زنجیروں نے اُسے پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

شتہ پھوری کا خاوند والئے ریاست کے ایک باثر درباری کے ہاں رہتا تھا۔ شتہ پھوری کی دوسری بہن اسی درباری کے نکاح میں تھی۔ شتہ پھوری کا شوہر غربت کی وجہ درباری کے ہاں ایک ہم زلف کا مقام حاصل نہ کر سکا تھا لیکن پھوری کو خاوند کی اطاعت بہرحال کرنی تھی۔ چترال میں ان دنوں پردے کا سخت رواج تھا اور پھوری نظر بھر کر اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہ سکتی تھی۔ پھر بھی محبت کی آگ دونوں کے دلوں میں شرر افشاں تھی چنانچہ ہفتے میں دو تین بار ایک دوسرے کا سامنا کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔ اور دونوں کے لئے یہ لمحہ کسی عید سے کم نہ ہوتا۔

جب ان کی محبت جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تو شتہ پھوری پر پابندیاں اور بھی سخت ہو گئیں ایک خادمہ کو اس پر پہرے دار مقرر کیا گیا۔ جب بھی شتہ پھوری باہر نکلتی تو وہ اس کے ساتھ ہوتی فردوس بھی اس تاک میں رہتا کہ کب اس کی پھوری باہر نکلے۔ جونہی موقع ملتا اپنی محبوبہ کو ایک نظر

دیکھ کر تسلی کر لیتا۔

ایک دفعہ بابا فردوس شام کی روٹی کھانے کے بعد چارپائی پر لیٹا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ بابا چارپائی پر دراز تھا۔ مگر نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا محبوب کی یاد ستا رہی تھی۔ درختوں کے پتے ہل ہل کر بابا کو اٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ اتنے میں بابا اُٹھ کر اپنے محبوب کے گھر کی طرف چل پڑا جب وہاں پہنچا تو شہ پھوری دوسری کنیزوں کی معیت میں پانی لے جانے کے باہر نکلی۔ بابا چاند کی روشنی میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنی محبوبہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر تابندہ چاند کا شکریہ ادا کرتا تھا اور کبھی اپنی محبوبہ کا نظارہ لیتا۔ اس حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے بابا اپنے گیت میں کہتے ہیں:

استری مسوا چہ ٹنڈر بک مہ پھوری کو موران متر بک

(ستارے چاند کا حاشیہ بردار اور غلام ہیں اور میری محبوبہ دوسری حسینوں کی سردار ہے۔")

بابا کے گیتوں نے پھوری کے عشق کو نخشت از بام کر دیا۔ اور پھر پھوری پہ پابندیاں بڑھ گئیں اور پھر اس کی سہیلیاں اُسے طعنے دینے لگیں کہ تیرا عاشق تار تجھے بدنام کر رہا ہے۔ اس پہ شہ پھوری فردوس سے ناراض ہو گئی اور شکوہ کیا کہ تیری ان حرکات سے میری زندگی دوبھر ہوتی جا رہی ہے اور مجھ پہ عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ ورنہ میرا اور کوئی گناہ نہیں ہے اس پہ بابا فردوس یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

مہ پھوری مہ سم ڈیش متے قہریں گدیرہ رینیاں ثان نہ کریں

(میری محبوبہ مجھ سے روٹھ گئی ہے اور میں آج کل اس کے عتاب میں ہوں
اے میری پیاری رفیق تو مجھ سے کیوں ناراض ہو جاتی ہے۔ میں اپنے قابو میں نہیں ہوں
شریر لوگ میری ہر حرکت کو تیری طرف منسوب کرتے ہیں اس میں میرا کیا گناہ ہے)

وقت گزرتا گیا دن مہینوں میں، مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے محبت کی جو آگ بابا فردوس کے دل میں لگی تھی وہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اب بابا کے ایک اور مسئلہ پیدا ہوا شہ پھوری اپنے بہنوئی کے گھر میں رہتی تھی اس کو حکمرانِ وقت نے دوسرے گاؤں میں زمین عطا کی اور وہ شخص بمعہ اہلِ خاندان اور ملازمین وہاں منتقل ہوگئے۔ اب بابا فردوس اپنی محبوبہ کے دیدار سے بالکل محروم ہوگیا۔

بابا فردوس اس فراق کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور سرکاری ملازمت کی پابندی اس کے لئے دردِ سر بنی ہوئی تھی آخر کار فیصلہ کیا کہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر اور کام اختیار کیا جائے تاکہ وقتاً فوقتاً اپنی محبوبہ کے دیدار کے لئے کوئی راہ نکال سکے اس غرض سے ملازمت سے مستعفی ہوکر گھر میں رہنے لگا۔

ایک دن بابا فردوس لبِ سڑک چنار کے سائے میں مست اپنے خیالوں کی دنیا میں محو تھا۔ اتنے میں شہ پھوری کا بہنوئی اُدھر سے گزرتے ہوئے فردوس کو دیکھ کر رُک گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اس سے کہا ملازمت کیوں چھوڑی اور اب کیا پروگرام ہے؟ بابا فردوس نے جواب دیا، سرکاری ملازمت کی پابندی سے تنگ آگیا تھا۔ لہٰذا استعفیٰ دے دیا۔ اب کوئی پرائیوٹ ملازمت اگر مل گئی تو کروں گا۔ ان دنوں میں خواندہ لوگ خال خال ملتے تھے۔ اس پر اس نے بابا فردوس کو دعوت دی کہ اپنے گاؤں میں دکان ڈال دیتا ہوں اگر آپ اس دکان میں بیٹھیں گے تو آپ کو معقول تنخواہ دے دوں گا۔ بابا فردوس اس پیش کش کو اپنے لئے خدا کی نعمت جان کر اسی وقت تیار ہوگیا۔ اور پھوری کے بہنوئی نے بابا فردوس کو دکان ڈال دی۔ اس پر بات اور بھی کھل گئی، سب کو پتہ چلا کہ بابا فردوس نے صرف اپنی معشوقہ کی خاطر سرکاری نوکری چھوڑ کر خان کی نوکری اختیار کی۔ لوگوں نے ملامت کی لیکن بابا فردوس اس کو اپنے لئے سعادت سمجھتا تھا کہ اس بہانے سے وہ اپنی محبوبہ کے قریب تو ہوگیا ہے۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو ثنہ چھوری کا شوہر اس کو مزید تنگ کرنے لگا۔ اور ثنہ چھوری سخت پریشان تھی۔ گھر کے دوسرے افراد بھی اس کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس مصیبت سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ ادھر فردوس نے یہ حالت دیکھی کہ اب اس کے محبوب کا اس گھر میں زندگی گزارنا مشکل ہوگیا ہے تو فردوس نے اسے لے کر بھاگ جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس حالت اور اپنے پروگرام کا ذکر اپنے گیت میں اس طرح کیا ہے:

تو یئے کیڑی حل مولوس خور و دوری

ادا تہ گنی ہیم کیہ مہ میرتہ وری

(اے میری محبوبہ! آپ خون کے آنسو بہاتی ہوئی غیر کے گھر میں نہ رہ میں تجھے لے کر بھاگ جاؤں گا تاکہ اس مصیبت سے تیری جان کی رہائی ہوجائے)

یہ وہ دن تھے جب بابا فردوس اپنی محبوبہ کو لے کر بھاگ جانے کی تیاری کر رہے تھے دونوں کے لئے یہ انتظار کے دن بڑے اضطراب کے تھے اور ہر ہر لمحہ باہمی مشورہ سے کام کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ دونوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھی جارہی تھی اور تیسرے فریق کو پیغام رسانی کے لئے استعمال کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے بالآخر بابا فردوس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ یہ تھی کہ ماچس کی دو ڈبیوں کو عام دھاگے سے ملا کر ایک ڈبی کو اس حویلی کے اندر سوراخ میں چھپا دیا جہاں ثنہ چھوری رہتی تھی دوسری ڈبی حویلی سے باہر ایک سوراخ میں چھپا کر رکھ دی۔ جب بات کرنے کی ضرورت پڑی۔ اشاروں سے ایک دوسرے کو مطلع کرکے ڈبیوں کے پاس آجاتے تھے۔ بابا باہر والی ڈبیہ کو لے کر راستے سے ہٹ کر کسی بہانے سے بیٹھ جاتا تھا اور پھر ان ڈبیوں سے ٹیلیفون کا کام لے کر ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ جب بات ختم ہوجاتی تھی تو دھاگے کو پھر باہر والی ڈبی پر لپیٹ کر انہی مخصوص جگہوں پہ چھپا دیتے۔ اس طریقے سے

ان کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک تو ضرورت کے وقت پیغام رسانی ہوتی رہی دوسرا یہ کہ ان کا راز افشا نہ ہوا۔

آخر وہ وقت آن پہنچا جس کی تیاری وہ کر رہے تھے۔ بابا فردوس اپنی محبوبہ کو لے کر بھاگ جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ اس کی محبوبہ بھی گھر والوں کی سختی، لوگوں کی ملامت اور طعنوں سے تنگ آکر بھاگ جانے پر رضامند ہو گئی تھی، تاریخ اور وقت کا تعین ہوا۔

ایک رات آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے سخت اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا سب لوگ آرام کی نیند سو چکے تھے بابا فردوس، پھوری کو ساتھ لے کر گھر سے نکلا۔ دن کو چھپ کر آرام کرتے تھے رات کو اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے علاقہ دیر میں داخل ہو کر نواب دیر کے ہاں پناہ گیر ہوئے جو ان کے دشمنوں کے دست برد سے محفوظ تھا۔ ریاست دیر کے نواب نے فردوس کی قدر دانی کرتے ہوئے اس کو باجوڑ کے علاقے میں تحصیل مونڈہ کا تحصیلدار مقرر کیا۔ جہاں وہ شہ پھوری کو لے کر رہنے لگا۔

لیکن یہ دن بابا فردوس کے لئے پہلے سے بھی زیادہ آزمائش کے نکلے۔ چونکہ بابا شریعت کے بڑے پابند تھے اور شہ پھوری منکوحہ تھی۔ جب تک وہ طلاق نہ لیتی بابا فردوس اس کو اپنے لئے حرام سمجھتے تھے۔ لہٰذا وصال میں ہجر کے دن گزر رہے تھے۔

جب شہ پھوری کے خاوند کو پتہ چلا کہ وہ دیر چلے گئے ہیں تو اس نے اور پھوری کے بہنوئی نے کوشش کی کہ کسی طرح دونوں کو قتل کیا جائے لیکن یہ اُن کے بس سے باہر تھا نا اُمید ہو کر شہ پھوری کے شوہر نے اس کو طلاق دے دی جس کی اطلاع بابا کے رشتہ داروں نے اسے دی اور اس طرح دونوں ازدواجی زندگی میں ڈھل گئے۔

تھوڑے عرصے بعد والیٔ چترال کا انتقال ہوا۔ اور بابا فردوس کے مخالف درباری کا زور ٹوٹا۔ لہٰذا بابا فردوس اپنے خویش و اقارب سے ملنے کے لئے اکثر چترال آنے جانے لگے

لیکن مستقل طور پر چترال میں سکونت اختیار نہیں کی کیونکہ نواب دیر کے ہاں بڑی قدر و منزلت سے رہ رہے تھے۔ اسی طرح بابا فردوس کے وہ دن بڑی عیش سے گزرے۔ لیکن اس کی آخری خواہش پوری نہیں ہوئی جس کا ذکر اس نے اپنے گیت میں بھی کیا تھا:

مہ پھوریو نامو کوستے مو لاکھور

مہ پھوریو سار نست مہ گورہ لاکھور

(میری محبوبہ کا نام کوئی دوسرا نہ رکھے۔ کیونکہ یہ نام میری محبوبہ کے سوا کسی دوسرے کو زیب نہیں دیتا۔ اور میری یہ خواہش ہے کہ میری محبوبہ سے پہلے میں دفنا یا جاؤں کیونکہ اس کے بعد زندہ رہنا میرے لئے بے کار ہوگا)

لیکن فردوس بابا کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور دو لڑکیوں کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لئے اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اپنی رفیقۂ حیات کے بعد بابا زیادہ دیر تک یہ غم نہ سہہ سکا۔ اس کی صحت بگڑنے لگی۔ عمر کے آخری دن بیماری کی حالت میں وطن سے دور پشاور میں اپنی لڑکی کے ہاں گزارے۔ اور بالآخر وہیں طویل علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔

کنحوئے لتو گونیاں جوست بیتی جوالی

ہوشٹس نوار یتم مہ رفیق کھوالی

(راستے میں دوپہری نلد آرہی ہیں۔ ابھی ذرا فاصلے پر ہیں اور پہچانا نہیں کہ میرا محبوب کون سا ہے۔)

گو کہ بابا آج اپنے آبائی وطن چترال جنور سے سینکڑوں میل دور چارسدہ روڈ پشاور کے نزدیک خان قلی خان کے مزار کے پاس ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن یہاں کے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں اس کی یاد تازہ ہے۔

ثانو پچھیساں مہ اسکیم پھوری

اواتہ سم دیشں نو گومان تہ دوری

(اے دلبر! اگرچہ میں تیری بے رُخی کی وجہ سے تیرے کوچے میں قدم رکھنے سے گریز کرتا ہوں، تاہم تیری یاد سے دل بیتاب ہی رہتا ہے اور اپنے فیصلہ پر قائم رہنے کو تیار نہیں ہوں)

شوپی سورہ دوم خوش کھار وگمبوری

گمبوریو اِسپرو یو وچھاروس کندوری

(اے دوست! تو چمن کا پھول ہے۔ زمین پر گرجانا تیرا شایانِ شان نہیں ہے۔ تیری تخلیق میری زینت بننے کے لئے ہوئی۔ اس لئے لازم ہے کہ میرے سر پر تجھے مقام ملے)

تو لئے کیڑی حال موبوس خُور و ڈُوری

اوا نہ گنی ہیم کیہ مہ میسر ژوری

(خون کے آنسو بہا کر رقیب کے گھر رہنا تیرا کام نہیں۔ میری حُور ئیں تجھے لے کر کہیں اور نکل جاؤں گا)

مہ پھوری مہ سنم دیش متے تھےرین

گدیری رینیاں ثنان تہ کارین

(تیری بے رُخی اور سرد مہری نے میری یہ حالت کر دی ہے کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ہیں)

اِستاری مسو آچہ شُدار یک

مہ پھوری کو مورا نان متاریک

(میرا محبوب افسرِ خوُبان ہے۔ جیسے ستارے چاند کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں)

مہ پھوری مہ سنم دیش گُروئی اَسور

پرچھان اُخلی چوڑ سوئی اُسور

(میرا محبوب مجھ سے رُوٹھ گیا ہے۔ زُلفِ پریشان کو سنوار کے چوٹی اور لٹ بنائی ہے اور میری پریشانی میں مزید اضافہ کیا ہے)

گنھڑُل تو گونیاں خوش پھوریو چے : ہیچ
غیژ پہ دُ مسار وغون مہ پھوریو : غیچ
(جو دو خواتین گلی سے گزر رہی تھیں اُن میں سے مَیں نے اپنی محبوبہ کو نشیلی آنکھوں کے سبب پہچان لیا ہے۔ اُس کی آنکھیں تراشے ہوئے ہیرے کی مانند ہیں)

پرچم رے نوریم تترڑیو جُورُدنی
مہ پھوریو پرچم پھوریتیس غیژونی
(معشوق کی زلفیں تاب دار ہیں اور پیچ گھنگھریالے ہیں)

تہ تکہ چمہ تہ سورو شکھُور
دُیستو پوشیتم اللہ شکُور
(تیرے سینے پر زیور اور تیرے سر پہ چھتری۔ خدا کا شکر ہے کہ مَیں نے تجھے پہچان لیا)

مہ پھوریو نامو کوس نے مولاکھور
خوش پھوریو سار نست مہ گورالاکھور
(میری محبوبہ کا نام کسی دوسری حسینہ کا نام کبھی نہیں بن سکتا معشوق سے پہلے مجھے موت آجائے) ❖

نانوژان

حمید آمان ورشگوم کے علاقے تیسین کا رہنے والا تھا۔ مگر اُس کے ماں باپ نے بہ سلسلۂ رضاعت لاسپور کے تاریخی مقام ہرچین میں بڑے قبیلے کے شاہ ولی محمد کی بیوی درنگ خاتون کے حوالے کر دیا جس نے دُودھ پلا کر اس کی پرورش کی۔ درنگ خاتون ایک نیک سیرت خاتون تھی۔ وہ چھ دن تک روزہ برقرار رکھتی اور ساتویں دن افطار کرتی۔ آمان اُسی نیک دل خاتون کی آغوش میں پل کر جوان ہوا۔ ابھی اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی کہ اس کی نیک سیرتی اور نیک صورتی کے چرچے دُور دُور تک ہونے لگے۔

حمید آمان اپنے ہم عصروں میں بے مثل حسین نوجوان تھا۔ فنِ سپاہ گری، نشانہ بازی، شمشیر زنی تیراندازی اور تیراکی میں اپنا مدِمقابل نہ رکھتا تھا۔ پولو جسے اب بھی یہاں انتہائی اہمیت حاصل ہے اور بہادرانہ مشغلوں میں شمار ہوتا ہے کا مایۂ ناز کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ اسی دوران "ہرچین" لاسپور سے اس کے ماں باپ کے پاس دستور کے مطابق بغرضِ "پیٹریمیک" تیسین واپس لے گئے۔ حمید آمان کے ماں باپ نے خوش ہو کر بطور "گھنہ نمار" اور "ٹیسکو درائی" حمید آمان کے رضاعی والدین کو بہت سی قیمتی اشیاء تحفہ اور انعام میں دیں۔ نیز ان دنوں چترال

کی حدود میں واقع بیترو کے "دواخت" نامی گاؤں سے اس طرف برسط نامی علاقہ کو بطور "درالی" شیر رضاعت کے عوض ان کو جاگیر میں دے دیا جو کہ "بیترٹس رکھینی" اور "ڈھوک رکھینی" نام سے مشہور تھے۔

اپنے والدین کے پاس جانے کے کچھ عرصہ بعد حمید آمان نے چند روز بخار میں مبتلا رہ کر عین شباب ہی میں اس جہانِ ناپائیدار سے سفرِ آخرت باندھا۔ اپنے پیچھے کوئی یادگار نہیں چھوڑی حمید آمان کی رحلت کر جانے کی خبرِ وحشت اثر سے "درنگ خاتون" کا بُرا حال ہوا۔ خوشی کی جگہ صفِ ماتم بچھ گئی۔ حادثہ ہی جان گداز اور الم انگیز تھا کہ "درنگ خاتون" کو جتنا بھی غم ہوتا کم تھا ہر چند کہ انہوں نے خود غم غلط کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود ثابت ہوئی۔ ہمیشہ رضاعی بیٹے کے غم میں آنسو بہاتی اور کفِ افسوس ملتی رہی۔ اس واقعے کے بعد تنہائی اختیار کر لی۔ ولیہ جیسے طریقے پہ پہلے سے تھی۔ اب اُس کی ریاضتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اور شب و روز یادِ الٰہی میں وقت گزارتی۔

اتفاق کی بات کہ اسی سال گرمیوں میں اُدھر ورشگوم کے سرکردہ لوگ اپنے حکمران کی معیت میں لاسپور میں بہ سلسلہ "غشٹریک" سیر و سیاحت کے لئے دورے پہ آئے۔ ان کے پروگرام میں "ہرچین جنالی" یعنی ہرچین کے پولو گراونڈ میں چوگان کھیلنا شامل تھا چنانچہ وہ ہرچین تک آ گئے۔ سفری شامیانے لگوائے گئے۔ اور کل کو پولو کھیلنے کا اعلان بھی ہوا۔ اس گہما گہمی میں درنگ خاتون کو بھی اطلاع ہوئی۔ یہ سُن کر اُس خاتون سے رہا نہ گیا کہ حمید آمان کے بعد کوئی دوسرا آ کے ہرچین جنالی میں پولو میچ کھیلے۔ اپنے "چاپہ خانہ" سے باہر نکلی اور پولو شروع کرنے سے قبل ہی سیدھی پولو گراؤنڈ آ کر "غاڑ دار" بجانے والے اُستادوں سے "ڈول" "دامہ" اور "سرنائے" آلاتِ موسیقی چھین لئے۔ حکمران اور رؤسائے ورشگوم کو جب اس واقعے کا پتہ چلا تو ورشگوم شِشدر رہ گئے۔ وقتی طور پہ ایک خاتون کے ساتھ تحکمانہ انداز اور

طریقے سے پیش آنا اُن حکام اور سردارانِ قوم کو کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا اس لئے
بجائے سختی کرنے کے حکمرانِ ورشگُوم خود اس خاتون کے پاس چلا آیا اور ملتجیانہ انداز میں
دُرنگ خاتون سے درخواست کی کہ محترمہ! ہمیں تمہاری ہر بات منظور، تمہاری ہر خواہش
سر آنکھوں پر، ہم پوری کریں گے جو بھی تمہارا مطالبہ ہے صاف صاف بتا دو۔ اور جو مانگنا ہے
ہم سے ابھی مانگ لو۔ ہم اپنے شوق پر قیمتی سے قیمتی شے کو بھی قربان کریں گے۔ آج کا ہمارا
پولو کھیل ان سامانِ طرب کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ چیزیں اگر ہمیں واپس کیں تو بڑی عنایت ہوگی
نیز آپ کے احسان کے ساتھ ہم اپنے کھیل کا آغاز "غاڑہ دار" سے کریں گے۔ اگر "غاڑدار" نہ بجایا جائے
تو کھیل کا بھی کوئی مزہ نہ رہے گا۔ دُرنگ خاتون حکمران ورشگُوم کی باتیں تحمل سے سنتی رہی
اور ساتھ ساتھ اپنے رضاعی بیٹے حمید آمان کے غم پر کافی دیر تک آنسو بہاتی ہوئی، پھر حاکم سے
کہنے لگی کہ میرا حمید آمان آج جو نہیں تو "ہرچین جنالی" میں آپ لوگوں کا پولو دیکھنے کا کون؟ جو گان
وہ کھیلتا تھا، جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے پیروجوان اور مرد و زن کا یہاں مجمع لگتا۔ اور
میلہ لگاتے۔ تمہارا میچ دیکھ کر تمہیں داد دینے والا آج یہاں مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ اور تماشائیوں
کے بغیر تمہارا پولو کھیلنا بے سُود ہے۔ لوگ تمہارے مطربوں کو نہیں بلکہ تمہاری جوانمردی اور ماہرانہ
فن کا مظاہرہ دیکھیں گے۔ اگر "دُودل دماموں اور سُرنائے" سے مردانگی دکھانے کا یقینی شوق رکھتے
ہو تو اس شرط پر سامان تمہیں واپس ملیں گے کہ ہرچین جنالی یعنی پولو گراؤنڈ پر "قلتاک" اور لاسپور
کے سپوتوں سے "جو تھنگی" آپ لے رہے ہیں وہ آئندہ کے لئے ختم کرنے کا اعلان کریں! اس کے
علاوہ اس وادی میں جتنی زرخیز اراضی اور شکارگاہوں اور چراگاہوں کو آپ نے جبری جاگیر بنائی
ہے اس سے بھی دستبردار ہو کر یہ تمام زمینیں لاسپور والوں کو دے دی جائیں صرف ان
مطالبات کی منظوری پر آلاتِ موسیقی واپس کر دوں گی۔ سُننے کے بعد حکمرانِ ورشگُوم نے
دُرنگ خاتون کے تمام مطالبات حسبِ وعدہ مان لئے اور موقع پر ہی اس کا عام اعلان بھی

کر دیا اور بڑی منتوں کے بعد درنگ خاتون سے سائنسدانوں کے انسٹرومنٹ واپس لے لیے۔

دوپہر کے بعد قاعدے کے مطابق "خار واڑ" بجائے گئے۔ مگر شائقین پولو کی آمد گزشتہ وقتوں کی بہ نسبت خاصی کم تھی بعض اکا دکا نیچے ہی دکھائی دے رہے تھے کھیل شروع ہوا ہے چند تماشائی جن میں زیادہ تر بچے ہیں ہرچین جنالی کے آس پاس "چلکی، سومین تور اور تریک" کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ایک آدھ نظر پولو گراؤنڈ میں "غاٹسندوں" کی طرف دیکھتے ہیں۔ بڑوں میں حمید آمان مرحوم کے چوگان کھیل کا تذکرہ ہے۔ جو بچپن سے انہیں جانتے تھے سبھی اس کی تعریفیں کرتے۔ بیتی یادیں ہر کوئی دُہراتا۔ پاس بیٹھے ہوئے بچے اور بھی قریب آجاتے اور غور سے بڑوں کی طرف کان دھرتے ہیں ادھر یہ گنے چنے چھوٹے بڑے تماشائی محوِ گفتگو تھے کہ اس اثنا میں بوڑھی درنگ خاتون بھی حمید آمان کی جدائی کا غم تھوڑی دیر کے لئے بھلانے کی کوشش میں پولو گراؤنڈ کے قریب آپہنچی۔ وہ حمید آمان کی یاد میں اکثر گنگنایا کرتی تھی۔ معدودے چند تماشائیوں اور چوگان کھیلنے والوں پر نظر پڑتے ہی بیتے دنوں کی یادیں آنے لگیں۔ دل کے زخم پھر سے ہرے ہوئے جنالی کا نظارہ، "پٹنج" چھین کر کھلاڑیوں کا ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی تگ و دو اور جان کی بازی لگانا، گروہ در گروہ شائقین کا جمگھٹا، اچھے کھیل کا مظاہرہ دکھانے والوں کی تعریف میں ہر طرف سے وادی میں گونجنے والی صد تحسین و آفرین کی صدائیں، آس پاس کی ہریالی اور دلربا مناظر الغرض کھلاڑیوں کو پُرجوش کرنے والی کانوں پڑتیں تالیوں کی مسلسل دل خوش کن آوازیں سب ایک سے بڑھ کر اُس کے پریشان اور مغموم خیالوں میں ہو گزرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ رضاعی بیٹے حمید آمان کی یاد ستانے لگی۔ انہی خیالوں میں کھوئی درنگ خاتون ہرچین جنالی کی خوب صورتی اور دل کشی کی تعریف میں حمید آمان مرحوم کو مخاطب کر کے اپنے دلی جذبات کا اظہار یُوں کرتی ہوئی غموں کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے:۔

ہر چین جنائی ٹشیور تان ننوژان نان غیروم
جنائی وارژین ٹشیوتان ننوخوش نان غیروم
میدان ہر چین جاذب نظر ترے دم سے
میدان کے سب نظارے دل فریب ہیں دُور تک

اے لاڈلے ماں تجھ پہ فدا
ماں کا پیار تجھ پہ فدا)

ادھر ہر چین کو اگر غور سے دیکھا جائے تو "ڈنبہ ان دیہہ" کے اوپر ایک سُوا نہر ہے ۔ جسے "ژ انگ ثوئے" کہا جاتا ہے۔ جہاں بہار کے دنوں گوگی اور فاختے بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جن جن کا بے حد شکار ہوتا ہے۔ اسی طرح حمید آباد حُسن کا مرکز، یٰسین سے نسبت رکھنے کی بناء پہ جہاں کی دوشیزائیں سادہ اور قدرتی حُسن میں اپنی مثال آپ ہیں۔

ثانگ ژ دیو کالکوران وخت ننوثان نان غیروم
یَسو نو میر ژوریان وخت ننوخوش نان غیروم
(تیری نشانہ بننے والی فاختاؤں کا موسم ہے
یٰسین کی دوشیزاؤں کا موسم ہے

اے رُوحِ من جان تجھ پہ فدا
ماں کا پیار تجھ پہ فدا)

ہر چینا فاڈو بوغے نانو ثان نان غیروم
میر ژُری لوڑاو گونی ننوخوش نان غیروم
(چوگان کھیلنے ہر چین جانا
پریاں تکنے آئیں گی

ماں کا پیار تجھ پر فدا

ماں کے لاڈ تجھ پر فدا

نوژان تہ لوڑاڈ گونیان ژانگ تہ پوشاڈ گونیاں نموژان نان غیروم
اُلک تہ آلاڈ گونیان تان نمو خوشں نان غیروم
(بیگانے تکنے اپنے ملنے آتے ہیں
چاہنے والی آتی ہے دل لگی کو

اے رُوحِ من ماں تجھ پر فدا

اے ماں کا پیار تجھ پر فدا)

مہ ژاڈ شنخطی غاڑ کو روئے تان نموژان نان غیروم
شنخطیار یشٹوانگوئے تان نموخوشں نان غیروم
(شرطی چوگان کھیلنا مشہور تیرا نام
جیت کے بازی انعام پانا تیرا کام

ماں کا لاڈ تجھ پر فدا

ماں کا پیار تجھ پر فدا)

لاسپرئِگ شُم بل بوغے تان نموژان نان غیروم
جم موشیو نام نیستان نموخوشں نان غیروم
(لاسپُور کے شیر دلوں کے ہمراہ جا
مردانگی کا نام پاؤ گے

اے رُوحِ من ماں تجھ پر فدا

ماں کا پیار تجھ پر فدا)

تہ چیترِ دگورا دوم تان نغوژدان غیروم
ہر چینو لشٹ گانزا دوم تان نغوخوش نان غیروم
(کہاں تعصب میں تیرے خیمہ کروں
مخمل نما میدان ہر چمن میں کروں

ماں کا پیار قربان جاؤں
ماں کا لاڈ تجھ پہ فدا)

تہ چیترِ دکیہ ودُری تان نغوتشان نان غیروم
گوئے مشکِ عنبرِ دودُری تان نغوخوش نان غیروم
(خوشبو تیری خیمہ کو کیسے چھو کر
آئے گی یہ مشک عنبر میں بھیگی ہوئی

اے روحِ من ماں تجھ پہ فدا
ماں کا پیار تجھ پہ قربان)

نان وَتتے کیہ غیروم نغوژدان نان غیروم
سوری بزبارمہ غیرودم نیتین پروانہ پولیم
جمیرآمان نان غیروم
(ماں تجھ پہ قربان کیسے ہو جاؤں
ہما بن کر تیرے ساتھ رہوں

اے رُوحِ جان تو ہی بتا
پروانہ وار جلتی رہوں)

دُرنگ خاتون یو یو گمراؤنڈ کے ایک کونے میں حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہی

پوپو گراؤنڈ، وہی رنگینی، وہی دلکشی لیکن ایک ہستی کے نہ ہونے کی وجہ سے ویران دکھائی دے رہی ہے اور سانپ بن کر اس کی روح کو ڈستی جارہی تھی۔ یہ اس کی آخری بار پوپو گراؤنڈ آنا تھا اس کے بعد اس نے پھر کبھی اُس مقام پر قدم نہ رکھا۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے وہ اتنی زیادہ نہ تھی لیکن حمید آمان کی ہستی کی طرح اس کی خوشیاں بھی ختم ہوتی جارہی تھیں۔ ایک یاد تھی ایک ہی خیال وہ ایک ہی تصویر جو اس کے مقدس ذہن پر نقش تھی۔ کائنات کے ہر ذرے ذرے پر حمید آمان کا پُرکشش چہرہ مُسکراتا نظر آرہا تھا جس کی بے وقت موت کا صدمہ اس کے دل پر بہت گہرا درد ثابت ہوا۔ حمید آمان کی یاد اس کو گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ جلارہی تھی اور آخر کار وہ دن بھی آیا جو وہ بھی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی۔ صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی علاقے بھر میں بچے بچے کی زبان پر نانو ثان کے وہ اشعار زندہ ہیں جو دُرنگ خاتون کی زبان سے نکلے تھے:

یُورمس بیگم

یورمس بیگم وادیٔ چترال کے علاقے شغور کی ایک خاتون تھی جس پہ چترال کا ایک شہزادہ فریفتہ ہوگیا. لیکن یورمس کی شادی ایک دوسرے شخص سے ہوگئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اور نہ ہی شہزادے کا حسب نصب اور نام معلوم ہوسکا۔ البتہ اس لوک گیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شہزادے کا باپ اس کے اس پیار سے خوش نہیں تھا اور جب شہزادہ وارفتگی میں محبوب کی تعریف کرتا تو اس کا باپ اسے عاق کرنے کی دھمکیاں بھی دیا کرتا۔

گو اس کہانی کے انجام سے کوئی واقف نہیں لیکن جو تصویر ان شعروں کے حوالے سے بنتی ہے وہ شہزادے کے صادق عشق کے ساتھ محبوب کے حسن بے پناہ کی ایک مکمل تصویر ہے۔

اس کہانی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ گیت رنجیت سنگھ کی حکومت کے دور میں تخلیق ہوا ہے۔

شغور گا زومہ دنیا رُیو گوئے

ایہہ مو لوٹسے کہ بو یکرہ یو دوئے

(شغور کے سبزہ زار میں میری معشوقہ خراماں آرہی ہے۔ اے میری معشوقہ! تم آنکھیں اٹھا کر نہ دیکھ۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے تیر نظر سے پرندے زمین پر آگریں)

تکان بیچھیرے چھیرتہ پنڈ گوئے

ے گدیری مگس چھیرو سوری گوئے

(تو باہیں نہ پھیلا ایسا نہ ہو کہ پروانے اور پتنگے تجھ پر جانیں نچھاور کرتے لگیں)

ٹہ شٹا رنوری اندھتیاری موڑی

اوہ اُد یتم تہ کتا بان موڑی

(میری محبوبہ کا دیس اندھا حق گاؤں اور ٹہ شاٹ کے سنگلاخ پہاڑیوں کے عین وسط میں واقع ہے۔ اے میری محبوبہ اتُو اپنی متبرک کتاب کی خاطر (مُراد قرآنِ کریم ہے) میری حالتِ زار پر رحم کر)

مہ تت ربران کہ اوہ تہ داڑتم

ے رنجیتو بو نوتے تہ ثاوُ بڑیم

(میرا باپ مجھے ملک بدر کرنے کی دھمکی دے رہا ہے اگر میں جذباتِ عشق سے مغلوب ہو کر تیرے خلاف احتجاج کروں تو میں اکیلا اور تن تنہا رنجیت سنگھ کی فوج کو شکست دے سکتا ہوں)

مہ تت دریان کہ دُور تہ تے ٹش نوکوم

ے مہ دوست مہ تے باشے تہ خبر بہ دکیہ کوم

(میرا باپ مجھے دھمکی دے رہا ہے کہ میں تجھے اپنی جائداد سے بے دخل کر دوں گا۔ میں اپنی محبوبہ کی خاطر سب کچھ سہنے کے لئے تیار ہوں۔

ے دُور تو ادیتم بیندا گن گنی

یورمس بیگمو کیڑے گنیا وانی

(آج میری محبوبہ کے گھر میں گہما گہمی ہے اور یورمس بیگم کی برات آنسو بہاتی ہوئی جارہی ہے)

یورمس بیگم تہ نصیب کوُ کوسوم
اوہ تہ پہ دشٹ چھوتیوچہ گوسون ؎

(یورمس بیگم! تقدیر تجھے کس گلی میں لے جانے والی ہے۔ میں تو ہر وقت تمہارے پاؤں تلے مٹی کی حیثیت رکھتا ہوں)

دواختو بیلہ دوست دوپھاسہ گیۓ
ہر دیو ٹیکہ ہوست دیکو بٹش کوۓ ؎

(مہر ماہ جب وہ مہ جبیں نمودار ہوا تو ہم دل تھام کے حیران رہ گئے)

ہوشوبندہ گان بیری موژنسور
آسمان پریو ژور شوخی اسور ؎

(میں تو پہلے سے اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھا ہوں۔ دوسرے جتنے بھی ہوشمند ہیں وہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلیں کیونکہ آج پریوں کی شہزادی آسمان سے زمین پر اترنے والی ہے جس کو دیکھ کر ہوشمند لوگ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں گے۔

یورمس بیگم نصیب ہموشٹ ہوۓ
نصیبو کور موکیانی کورین بوۓ ؎

(یورمس بیگم! یہ تقدیر کا فیصلہ تھا جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب تقدیر کو بدلا نہیں جاسکتا)

یورمس بیگمو دواخت پونہ شیر
دافیوجمیوٹ ڈاقو دونہ شیر ؎

(محبوب کا در میری راہ میں واقع ہے اب اس گلی سے گزرتے ہوئے حسرت کے ساتھ انگلیاں دانتوں میں دبا کر نکل جاتا ہوں۔ کیونکہ میرا محبوب آج اس دیس میں موجود نہیں)

نان دوشی

چترال کے ادب، ثقافت اور زبان سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے چترال کے مشہور لوک گیت "نان دوشی" کو گایا یا سنا نہ ہو لیکن شاید یہ کوئی نہ بتا سکے کہ یہ کہانی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور آج بھی شادی بیاہ کے موقع پر بارات کے آگے دو شخص "نان دوشی" کے لوک گیت کیوں گاتے جاتے ہیں۔

چترال کے بالائی علاقے مستوج کے شمال کی طرف وادیٔ لاسپور اور غذر واقع ہے جسے سطح سمندر سے ۱۲۲۵۰ فٹ کی بلندی پہ درّہ شندور ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے۔ یہ درّہ اپنی تین میل لمبی خوب صورت جھیل کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔

صدیوں پہلے لاسپور کے ایک گاؤں "بروک" میں "نان دوشی" نام کی ایک دوشیزہ کی شادی علاقہ غذر کے ایک سرو قد نوجوان سے ہوئی تھی۔

"نان دوشی اپنے حُسن اور خوب صورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اسی طرح غذر کا نوجوان بھی ایک وجیہہ اور خوب صورت شخص تھا۔ بارات بڑی دھوم دھام سے لاسپور پہنچی۔ اور شادی کی رسومات کا آغاز ہوا۔

چترال کے سرحدی علاقوں میں مکانوں کی تعمیر ایک خاص طرز کی ہوتی ہے۔ ایک گھر کے عموماً تین کمرے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے والے کمرے کو "دہلیز" کہا جاتا ہے اس سے آگے ایک بڑا کمرہ ہوتا ہے جسے "بائی پیش" اور اس سے ملحق تیسرے کمرے کو گونج کہا جاتا ہے جو سٹور کا کام دیتا ہے۔

آج کی رات نان دوشی کی سہانے اپنے ماں باپ کے گھر آخری رات تھی۔ ہر طرف روشنیاں اور شور تھا بارات "بائی پیش" کمرے میں موسیقی کے محفل سجائے ہوئے تھے۔ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں ڈھولک کی تال پر گیت گا رہی تھیں۔ آخری کمرے میں نان دوشی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے حسن کو آج چار چاند لگ گئے تھے۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے دل میں دلہن بننے کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ ہر طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں کہ اچانک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ترتیچ سیر کی پریوں کی نظر نان دوشی کی خوشیوں کو ڈس گئی اور نان دوشی دلہن بن کر سسرال جانے کی بجائے دل کا اچانک دورہ پڑنے سے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور دلہن کی سرخ جوڑے میں نان دوشی کا بے جان جسم رہ گیا۔

ماں نے "نان دوشی" کی اچانک موت پر بڑے تحمل اور تدبر سے کام لیا کسی کو خبر تک ہونے نہ دی۔ چپکے سے اپنی دوسری بیٹی دوشی کو دلہن بنایا۔ خوشیوں کے رقص جاری رہے۔ نان دوشی کی نعش تیسرے کمرے میں رکھی ہوئی تھی اور دوشی کی بارات جا رہی تھی۔ ماں کوٹھے کی چھت پر بیٹھی نوحہ کناں تھی ؎

ہر دوشس نوواۓ اۓ نان!
دوشیو دیتی کیہ نان دوشیو کمہ نس نوواۓ نان دوشیو تے لہ ژور ئے۔

اے ماں! کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ تو نے دوشی کے عوض نان دوشی کو ہمیشہ کے لئے خرید لیا دوشی مجھ سے دور چلی گئی مگر نان دوشی کی قبر تیری نظروں کے سامنے

لہے گی ۔افسوس اے معصوم نان دوشی کی موت ہے

"ہروشں نوواے اے نان!

یورسے دیتی کیہ لشٹ گنہ و۔ہروشں نوواے نان دوشیئوتے لہ ژور رائے"

اے ماں! کیا یہ بات درست نہیں کہ سورج کی شعاعوں نے گھاس کے میدان پر سنہری چادر

بچھادی لیکن یہ سب دلکش نظارے میرے لئے ہیچ ہیں ہے

"ہروشں نوواے اے نان!

یورسے دیتی کیہ ناگمٹ ۔ تورلیت نوواے نان دوشیئوتے

لہ ژور رائے

اے ماں! کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ سورج کی شعاعیں گھر کے سقفی روشندان

پر پڑیں ۔مجھے نان دوشی کی موت کا صد افسوس ہے ہے

ہروشں نوواے اے نان!

لشٹ کوشتدورسے مہ ژورت ۔کھرغیر نواے نان دوشیئوتے

لہ ژور رائے

اے ماں! اے شتدور! تو میری بیٹی کے لئے ایسا ہموار ہوجا جیسی پھولوں کی سیج

افسوس تجھ پیارے معصوم نان دوشی کی موت ہے

ہروشں نوواے اے نان!

یورسے توری کیہ بروک دیرو

برلیٹس نوہائے ژان نان دوشیئوے

لہ ژور رائے

اے ماں! کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ سورج کی شعاعیں "بروک دیر" مقام پر پڑیں مگر

تمہاری سہیلی ”برشش“ نہیں آئی۔ افسوس تجھ پر اے میری نان دوشی کی موت ے

ہروشٹس نووائے اسُے نان!

لشٹ شندورکیہ چوغین گنزول نووائے نان دوشیئو تے

لڑوررے

اے ماں! کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ درّہ شندور کے مخملیں گھاس میں بید کے درختوں کی ٹہنیاں دونوں جانب سے میری بیٹی کے لئے راستہ چھوڑتیں۔ افسوس تجھ پہ اے میری نان دوشی کی موت۔

دوشی کی برات آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ ماں اب نان دوشی کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوگئی ”نان دوشی“ ابدی نیند سوگئی لیکن اس کی یاد صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ہر شادی بیاہ کے موقعے پر وادی کے ذرّے ذرّے سے جھانکنے لگتی ہے۔

سینحو ملنگ

سنخیو ملنگ چترال کی حسین وادی میں ایک لوک گیت ہے جس کی خوشبو صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے۔ اس کہانی کے کرداروں کے بارے میں حقائق نہیں ملتے۔ مگر گیتوں کے حوالے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ سنخی ملنگ جس لڑکی سے محبت کرتا تھا وہ خود اسے ناپسند کرتی تھی اور اپنی رسوائی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی جب سنخی ملنگ نے معززین شہر کی وساطت سے رشتہ مانگا تو گھر والوں کو زیادہ اعتراض نہ ہوا۔ مگر لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا۔ یہ کہانی سنخی ملنگ کی اسی ناکامی اور نامرادی کو پیش کرتی ہے۔

اُٹا یتو ٹیکہ متے گوئے مہ ووی

کہوستانہ دوست ہو گور ملنگو کوری

تہ ملنگ کہ بہ پیام مقصدی توری

(جب میں اتنی ٹیلے سے گزرتا ہوں تو تیری خوشبو ہوا میں مل کر میرا خیر مقدم کرتی ہے۔ پھر مجھے چھو کر گزر جاتی ہے۔ میرے محبوب تو نے میری ساری اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ مجھے چھوڑ کر تم دُور بہت دُور چلی گئیں۔ مگر تمہاری خوشبو شرقت

میرے ساتھ رہتی ہے۔اے لوگو اس بے رحم دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ پیار نہ کرے کوئی کسی کو دل نہ دے جس طرح اس فقیر نے دل دے رکھا تھا۔ اس دُنیا میں محبّت کرنے والوں کے دُشمن بستے ہیں۔ یہ دنیا ظالموں کی بستی ہے۔ محبّت میں کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی خواہ موت ہی کیوں نہ ہو۔ کاش! میں اپنی محبّت کی منزل تک جاؤں اور پہنچتے ہی مرجاؤں)

مسکو دُشمنان گنی تنوانی گیرو

مہ حقہ ایلو بشگالی مہ بُلبلو بیرو

کیا نی کوم سیخو ملنگ ثران اللہ دیرو

(میں نے اچھے لوگوں کو تمہارے پاس بھیجا مگر اچھوں کے ساتھ برا ہُوا۔ میرے محبوب کے ماں باپ بے رحم ہیں۔ کسی کی بے قراری کی انہیں ذرہ بھر پروا نہیں۔ وہ غریبوں کو ستاتے ہیں۔ میری محبوب تو ہی بتا کہ یہ ظلم کیوں۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں آخر کوئی منزل تو بتا۔ ایک بار مجھے تم سے محبت ہوئی ہے۔ میں اس کو دل سے نکال نہیں سکتا۔ کاش! زندگی دینے کی چیز ہوتی تو میں اپنی زندگی تمہیں دے کر خود مرجاتا)

نہ ملنگ جان غیثری ملنگ نہ تت بو قمدار یئے

مہ لعلو زانگارہ کی ادیرہ حروشی دعئے مہ والماسیئے

بزیمی مہ واغو ثر یبے مہ داغ تتے حلالیئے

(میرا عشق غریب ہے کیونکہ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ کسی کو بھی میرے جذبات کی قدر نہیں مگر میری محبوبہ کے گھر والو تم میرے مقروض ہو۔ میرا ایک نایاب موتی تمہارے پاس ہے۔ وہ موتی میرا ہے میں اس کو دل کی قیمت دے بیٹھا ہوں۔ اس دل میں ہزاروں ارمان ہیں جو لازوال ہیں۔ میں اپنی زندگی دے چکا ہوں جس کی قیمت کوئی ادا نہیں

کرسکتا۔میری محبوبہ کی زندگی کے ساتھ میری زندگی ہے۔میری محبوبہ کی نازک جان کے صدقے۔میری قیمت وصول کریں۔میرے خالی جسم کو فروخت کردو۔میری جان اس کی ہے۔میرے آنسو اُلفت کا سمندر ہیں۔اس کی گہرائی میں جواہرات ہیں،قیمتی جواہرات،نایاب جواہرات)

زرین کفش تہ پونگا منتن زارسمہ کہ وم تھنویتن

رویان رحمت کو دور جعفربات کا نو تین

مہ رفیقو بیر نادد زور بویان مہ تزانو تین

(کیا میں اس نرم نازک بدن والی کو زرق برق لباس اور خوبصورت پاؤں میں پہننے کے لئے زرین جوتا پیش کرسکوں۔اے لوگو! تم میرے محبوب سے بہت مشکل کام لیتے ہو۔وہ پھول ہے۔وہ نازک جسم ہے جھکی ہوئی ڈالی کی طرح۔وہ کچھ نہیں کرسکتی وہ تصویر ہے،وہ مجسمۂ حسن ہے حرکت نہیں کرسکتی)

مہ آرمان مسوتین مس تہ چھر گوڑہ نار میریئے

چھک حرزائی تو کوئے کہ آر یر روئے مہ ریریئے

(اے چاند مجھے تم پر رشک ہے تو آسمان کا چاند ہے مگر میری محبوبہ زمین کا۔تو اس وقت یقیناً میرے محبوب کو جھانک رہا ہوگا۔اس کی سیاہ زلفیں بکھری ہوئی ہونگی وہ سو چکی ہوگی،بے خبر۔میں یہاں تڑپتا ہوں نیند مجھ سے دور بھاگ گئی ہے تیری روشنی میری محبوبہ کے چہرے کو چھو رہی ہوگی۔وہ مست خواب ہے اور تم گستاخ")
میری محبوبہ سادہ لوح نہیں مگر اداؤں سے پرہیز کرتی ہے۔اس کی دلربا ادائیں قاتل ہیں۔ان اداؤں سے دل والے کا بچنا ممکن نہیں۔

مسکو دشمنان گئی آو اما تام سلامو
مه دشمنو موخو آو یه نه خدایو کلامو

(شاعر اپنی محبوبہ سے شادی کی غرض سے گاؤں کے معززین اور علماء کی ایک جماعت دستورِ وطن اس کے ماں باپ کے پاس بھیجتا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ مخالفت نہیں کرتے ہیں مگر شاعر کی محبوبہ شادی سے انکار کر دیتی ہے جس پر شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تم معززین اور علماء ہی کو نہیں بلکہ خدا کے حکم سے انکار کیا ہے، تم ظالم ہو اور میں قابلِ رحم ۔)

خوش بیگم

خوش بیگم چترال کے علاقے غندر کی ایک حسینہ ہے۔ خوش بیگم شادی شدہ ہے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل پتہ نہ چل سکی مگر گیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوش بیگم شاہ کابل کی بیوی ہے اور چترال کے شاہی خاندان کا نوجوان امان اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ امان سے نہ صرف خوش بیگم کے اہل خاندان ناراض ہیں اور اس کا اپنا خاندان پسند نہیں کرتا بلکہ خوش بیگم بھی ناراضگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کہانی کا انجام کیا ہوا، گیت میں اس کا ذکر نہیں لیکن آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خوش بیگم کے عزیزوں نے اسے قتل کر دیا ہوگا کیونکہ جس طرح آخری شعر سامنے آتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امان دریا کے کنارے سویا تھا کہ دشمنوں نے تلوار کا وار کر کے اس کا صفایا کر دیا۔

یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ شعر اسی کے ہیں یا کسی دوسرے نے اس کی کہانی نظم کی ہے۔

خوش بیگم بیران دوروتے اوادی ہیم دوروتے

روئے تھنو صفت کورونیان آمان عاشق بچھوروتے

(خوش بیگم جب گھر جاتی ہے تو میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں لوگ اس کے

بدن کے فریفتہ ہیں مگر میں اسیرِ زلف ہوں)

خوش بیگم ٹمانگ تھیلنی نازک ٹوٹی قلم بروئی

روبان غیچہ حور سرٹیان متے گلاب گمبوری

(وہ نازک بدن گھنیری پلکوں والا محبوب جسے سب حور کہتے ہیں مگر میں اسے گلاب کہتا ہوں)

غرزہ و بتار رنن گوسُم نن گو دارک موژئی

خوش بیگم تہ دستا بندی خوش بیگو مت دیت کی

(میرے محبوب کے سامنے ننگ و ناموس، مہتر (اہلِ ثروت حکمرانی) کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے تو قدرت کی بہ کلی چاہیئے)

گوہر آمان ہو جم ٹوش او شوئے سکھان آریر دانو

گوہر آمانو ہمی ژیٹا و عشقو کونیان پرانو

(شیر میدان گوہر آمان جس نے رسموں کو تہہ کر کے رکھ چھوڑا ہے اب ترے عشق میں مبتلا ہو کر لاعلاج مریض بن گیا ہے)

خوش بیگم غرزیکان ژور غرزہ و قلا ہوران باتار

کو کیہ جبلتان ٹو امہ خوش بیگم مہ سار آتار

(غذر کی خوش بیگم جو غذر کی لوبان ہے لوگوں کے اکسانے پہ مجھ سے ناراض ہے)

اے بے وفا دنیا شوم دیو کیہ بقائے

خوش بیگم لو مہ سُم دیت شور ساٹو مہ نفاقائے

آہ! یہ دنیا ایک فریب ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں لیکن اے خوش بیگم

ایک بار پھر سے بات تو کر۔ کہ یہی میرا سرمایۂ حیات ہوگا)

قلمدار ہائے شرانہ بیبر نیسے لہ مہ میر نہ ائے

آمانیئے کوڑی بساں بخت پو لیرد تہ جنائے

(فقیر در پہ حاضر ہے باہر نکل اے میرے دلبر آمان کہاں جائے کہ قسمت اس کی یاوری نہیں کرتی۔)

غیر زو میر تہ دوریان گنی غیر زہ نہ او غوتے گویان

مہ تووڑ نو دو میان سے خوش بیگم دودوتے گویان

(غذر کی دوسری لڑکیوں کے ہمراہ ندی کنارے پانی بھرنے آتی ہو۔ اور یہ کہہ کر کہ یہ گریبان میرے افسانے کی نہیں ہے ٹوٹ جاتی ہو)

دورتہ گوٹار کسیران گمبوری بوچو چھیران

تہ آمانوژان پوچیکو خوش بیگم کیہ پشیران

(گلی کے چٹکتے ہی خوشبو تیری سانسوں کی آتی ہے۔ دل و جگر جل رہا ہے مایک تم ہو کہ دیکھتی بھی نہیں)

خوش بیگم تھنوڑ بیگیا ؤ غیر زو موژی کسیران

بوبی خوش بیگمو موشوت شب قدر لشیران

(تمہارے ناز و ادا کو غذر کے لوگوں وارے ہیں مگر قسمت تو اچھی اس ہستی کی ہے جس کے گھر کی روشنی تم ہو)

جنان چینیا پھی ڈھیوتے تروق رین نو بوئے

تہ موش کا یلا بادشاہ یا چھوتے لوق رین نو بوئے

(محبوب تو پیالہ بھرا ہوا شہد ہے میں اسے کڑوا کیسے کہوں شاہ کابل

تیرا شوہر ہے اُسے میں کیسے کم تر کہہ سکتا ہوں)

خوش بیگم غرزیکان شور غرزنہ گل سمیرگمبوری
بختور بیگو نُو بیس شب قدر تو غو دوری

(خوش بیگم دختر غرنا ایک گل صد برگ کی کلی کی طرح ہے خوش قسمت ہے نوبیٹہ بیگ نور برستا ہے جس کے گھر میں۔)

خوش بیگمو موش ویلاتی آمان تمار باک نوا
جموش جو آتر یرو بینی کہ ہوؤ آمان تہ آلاک نوا

(عشق ذات کو نہیں پوچھتا ہوں شاہی خاندان کا فرد امان ہوں مگر ایک مدت سے تیرے عشق میں مبتلا ہوں)

مثران کھنجوڑ کیبلی دون دُردانہ اسکیم پچھرے
فراموشیان موکو ہردی نو بوئے تہ سار خمائے

(اے یاقوت کے دانوں جیسے دانتوں والی۔ اے کوئل نما زلفوں والی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا تم بھی یاد رکھنا)

ڈقو کھنجوڑ کیبلی شہ پرچمان مو غیڑ اوے
اما نو عندرو نوری تان شرا تار مہ داڑ اوبے

(میری گھنگھریلے زلفوں والی۔ زلفوں میں کنگھی نہ پھیر —— میں تیرا متمنی ہوں تیرے دل سے نکل نہ جاؤں)

شہ جرہ پون کومن ہے تن سورو نو نماری آریت
خاتو نو نشہ گیبتی تیغو نو کاغ نماری آریت

(میں جسے منزل سمجھتا تھا وہاں تو گِدھ تھے۔ جنہوں نے جلے دل کو

لوٹ کھایا شاید قسمت میں یہی تھا)

قلمدار ہائے شرانہ مُلِس بیتی شیر

تہ فقیر کہ والٹی بیم دنیاتے مس بیتی شیر

(فقیر تیرے در پہ ہے لیکن میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے میں پروانے کی طرح جل رہا ہوں)

اُمانو نو لٹریمیاں اُمان پھور پھوین کسیران

مہ قالب تہ پروانہ مہ روح تہ فارزین کسبران

(دیکھ اَمان کے قدم ایک پل کو بھی نہیں رُکتے۔ جسم محوِ پرواز ہے۔ مگر نظر تیری دید کی منتظر ہے)

ورشنک متارہ بے رحم تو کوٹے ٹُدا روے

خوش بیگم عشقو کہ تور تیبائے نو کوئے زخم

(مہترور شکوم بے درد ہے وہ مہربان نہیں خاکساروں پہ اور تو بھی تو عشق کا ایک ظالم تیر ہے مجھے کیوں زخمی نہیں کرتی)

اَمان ٹرندان بارئے ٹُھو تارہ پور یکو بغائے

دُشمن کھونگو رو گنی آمانو ماریکو بغائے

(قلندر کے بھیس میں امان دریا کنارے سویا ہوا ہے اور دشمن کی تلوار اس کی زندگی ختم کرنے آگے بڑھ رہی ہے)٭

زیارت خان گدیزی

اگرچہ زندہ رود آبِ حیات است
دلے شیرازِ ما از اصفہان بہ

چاروں طرف فلک بوس پہاڑوں سے گھری ہوئی وادیٔ چترال جہاں اپنی مخصوص روایات، تہذیب وتمدن اور معاشرت کی وجہ سے یکتا ہے، وہاں جنتِ نگاہ مقامات بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اپنی خوش نما اور دیدہ زیب مقامات میں "سنوغر" کا گاؤں سرِفہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سنوغر کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اور وہاں کا ہر ایک ذرّہ اپنے دیکھنے والے کو متحیّر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر یہ کہ سنوغر کے لوگ چترال کی مخصوص روایات کے اندر انتہائی مہمان نواز اور فطرتاً مست ہیں ہمیشہ خوش طبع اور خنداں رہنا ان کا شیوہ ہے۔ یقیناً ایسی سرزمین ہی نامور ہستیوں کو جنم دیتی ہے۔

ملنگ زیارت خان گدیری اسی سرزمین کی پیداوار تھے۔ اُن کی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم

نہیں ہوئی تاہم قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۸۰ — ۹۰ء کے عشرے میں پیدا ہوئے۔ وہ چترال کے ایک معزز قبیلے "زوندرے" سے تعلق رکھتے تھے اور انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم انہوں نے نہیں پائی۔ تاہم اپنے زمانے کے مشہور طبیب صفایت شاہ سنوغر کی مجلس میں وہ علم طب اور دیگر علوم کا نقریری درس سنا کرتے تھے۔ قدرت نے ذہن رسا دیا تھا۔ اگرچہ وہ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے تاہم بعض امور پہ انہیں کافی دسترس حاصل تھی۔

شاعری سے فطری لگاؤ کے باعث یہی پیشہ اختیار کیا اور اپنے خیالات کا اظہار انتہائی خوبی سے کرنے لگے۔

زیرک بہ تخلص اختیار کیا۔ لیکن شہرت "گدیری" یا "ملنگ" کے نام سے ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں جب آپ نے شعر کہنا شروع کئے تو ان کے اشعار میں انتہائی گہرائی تھی مقامی معاشرہ استحسان نہ کرسکا۔ لہٰذا ان کو "گدیری" کہنے لگا۔ "گدیری" کے لفظی معنی دیوانے یا مجنوں کے ہیں ما انہوں نے بھی لوگوں کو زبان کو لبیک کہا اور خود کو "گدیری" کے نام سے پکارنے لگا۔ ملنگ کا لفظ بھی قریب قریب انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

جب ملنگ زیارت خان زیرک کو اس چیز کا احساس ہوا کہ لوگ ان کے خیالات سمجھنے سے قاصر ہیں یہی نہیں بلکہ انہیں مجنوں کے نام سے یاد کرتے لگے ہیں تو انہوں نے اسی بنا پہ اپنا تخلص "زیرک" رکھا جس کے معنی ہوشیار اور نکتہ سنج کے ہیں۔

گو وہ خود بھی اپنے کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے لیکن ان کی نظر میں وہ لوگ اس لفظ "گدیری" کے زیادہ اہل ہیں جو خود کو بظاہر عقلمند اور ہوشیار ٹھہراتے ہیں حقیقت میں وہ سلوک اور رمز دایما کو سمجھ نہیں سکتے جو کہ عقلمندی کی اصل روح ہوتی ہے۔

بقولِ حافظ :— اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مدامِ ما

لوگوں کے اس دعوے کو قبول کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ :

"ڈطنہ سف روئے تھرادای اوا گدیری اسوم
سوکو ہُٹس نوکورک ردیان کیہ جاشُوم"

(یہ مانا کہ وطن میں تمام لوگ ہوشیار اور عقلمند ہیں سوائے میرے۔ لیکن جو لوگ رمز و ایما اور سلوک کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ میرے آگے اُن کی کوئی قدر نہیں ہے سلوک کا لفظ کھوار میں لفظ "ادب" کے معنی سے بھی ملتا ہے)

اس کے بعد زیرکؔ نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ زیرکؔ کی شاعری میں عشقیہ مضامین اخوت، وطنیت، سلوک اور فلسفہ شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت نشیب فراز دیکھے اور زمانے کے تلخ و شیریں کو چکھا لہٰذا ان کی شاعری میں جہاں خیالات کی بلندی اور مستی ہے وہاں سوز و گداز بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

زیرکؔ کا اولین اپنے وطن زادو بوم "سنوغر" سے تھا۔ جب کبھی وہ "سنوغر" کا لفظ استعمال کرتا ہے جنت لفظ کا ضرور استعمال کرتا ہے

سنوغر کی تعریف میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

جنت سنوغر ژو یو چے ایچھوئے
سنوغرو ملنگ تا دردا چھو چھوئے

(اے جنت نظیر سنوغر تو اپنے چشموں کے پانی ندی، نالے اور خاص قسم کے خود رو پھلدار درختوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی بناء پر شاعر (سنوغر کا ملنگ) اپنی جان تک تجھے دینے کے لئے تیار ہے۔)

بیار ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گل گشتِ مصلیٰ را

ایک اور مقام پر جب ملنگ کو کسی بغاوت کے الزام میں تحصیل بدر کر دیا گیا اور کوئی

اٹھارہ سال تک وہ سنوغر سے باہر رہے تو پیارے وطن سنوغر کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی تھی
اور بے اختیار کہہ اُٹھتے تھے کہ

مہ دُور گا نزدا آسمانو تے ٹھوئے
جنّت سنوغر صفت وطنن کھوئے

"گانذ" ایک گاؤں کا نام ملنگ یہاں تحصیل بدری کی زندگی گزارتا تھا بطور
جاگیر ملنے کے باوجود جو ملنگ سنوغر کو بالکل پسند نہیں تھا۔)

کہتے ہیں کہ میرا گھر ابھی گانذی میں ہے۔ جو انتہائی بلندی پہ واقع ہونے کی بناء پر آسمان کے
زیادہ قریب ہے افسوس کہ جنّت "سنوغر" سے جدائی نصیب ہوئی جو تمام جگہوں کا سرتاج تھا۔

عشقیہ رومان کے سلسلے میں یہ معلوم کرنا کہ ان کا معشوق کون تھا بہت مشکل ہے کیونکہ زیرکؔ
جیسا کہ تخلّص سے ظاہر ہے۔ کسی قسم کے راز کا افشا اپنے عشقیہ اشعار سے نہ کرتے
تھے اور ہمیشہ اپنے عشق کو چھپانے کی کوشش کرتے۔

تاہم جیسا کہ تمام اہلِ ذوق اس بات پر متفق ہیں کہ یہ وہ آگ ہے جو خود لگتی ہے اور بجھنے کا
نام تک نہیں لیتی۔ اور دلِ عاشق بمثل غربال ہے جس میں پانی کا موجود رہنا ناممکنات میں سے ہے
کہتے ہیں۔ گاؤں سنوغر کے عین سامنے دریائے مستوج کے دوسرے کنارے پر ایک گاؤں
"یُوداک" آباد ہے جو زیرکؔ کے محبوب کا جلوہ گاہ تھا۔

زیرکؔ فن شناوری میں کمال تھے ممکن ہے یہ فن بھی اسی عشق ہی کا نتیجہ ہو۔ بہرحال زیرکؔ
موسمِ گرما میں جب کہ دریا اپنی انتہائی جولانی پہ ہوتا ہے دریا عبور کیا کرتے تھے۔ اور دیارِ محبوب
میں بغرض دیدارِ محبوب داخل ہوئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ملنگ کو لوگ "گدیری" کہتے تھے۔ اس لئے اُن کا ہر ایک کام دیکھا
جاتا تھا اور یوں اسی پردے میں ملنگ کو اور بھی قریب سے دیدارِ محبوب کا موقع ہاتھ آتا۔

"نہ بے مراتب خوابے کہ بہہ زبیدار لیست"

زیرک کے اپنے بقول ایک دفعہ جبکہ وہ موسمِ سرما کی رات کو تورکھو سے آرہا تھا۔ ایک طرف کئی دنوں سے مسلسل برف باری ہو رہی تھی۔ تقریباً کوئی دو فٹ برف پڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ملنگ کا یہ حال تھا کہ وہ برہنہ پا و برہنہ سر، رات کی تاریکی، انتہائی دشوار گزار راستہ دس بارہ میل کا بے آب و گیاہ بیاباں، رفیقِ سفر ہونے کے لئے بھیڑیوں کا سہارا ہنگام نیم شب، یہ صحرا نورد زیرک عازم سنوغر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسی راستے سے ہوتے ہوئے "پرواک" کا گاؤں آتا ہے جو محبوب کا مسکن ہے اور یہاں سے سنوغر کو راستہ جاتا ہے جو زیرک کا آبائی گاؤں ہے۔

انہی حالات میں صبح صادق کو زیرک دا "ڈپرواک" ہوا۔ عالم یہ تھا کہ ان کے ملیے ملیے پاؤں کے اوپر کوئی بالشت برابر برف پڑی ہوئی تھی اور عالم مستی میں عرق رواں دواں تھا۔ ایسے ہی صبح کی سفیدی بھی کافی حد تک پھیل گئی اور وہ محبوب کے دربار کے قریب پہنچا۔ کہتے ہیں کہ محبوب موسم کی خشکی کے متعلق بات کر رہے تھے کہ یہ آواز ملنگ کو سنائی دی اور یوں وہ اندر داخل ہوئے جب محبوب نے انہیں دیکھا تو وہ سہم گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ گھر والے انہیں سنبھال کر وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے ہی والے تھے کہ یہ قوی ہیکل ملنگ بھی گھر کے اندر داخل ہوئے گھر والے سمجھ گئے کہ یہ سب کچھ اس ڈراؤنی صورت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد محبوب کو دوبارہ ہوش آیا اور اُس کی اصلی حالت بحال ہو گئی۔

ملنگ کی خاطر تواضع کے انتظامات کئے گئے چونکہ وہ سخت سردی میں رات کا سفر طے کر کے آئے ہوئے تھے ان کے لئے آگ روشن کی گئی جب پورے خاندان کو سکون آیا تو ملنگ نے اپنے سفر کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔ اور بات جب یہاں پہنچی کہ جب میں نے اس گاؤں میں قدم رکھا اور مجھے موسم کے متعلق محبوب کی آواز سنائی دی کہ سخت سردی کا موسم ہے اور برف باری ابھی ختم نہیں ہوئی" تو ملنگ نے ان الفاظ کی ادائیگی اس شعر کی صورت میں کی۔

بہت بی ایبہ نیتیام مایون مہ گور زینہ کی آواز آریر
دوست مہ نستتو نسی بیر یوشاناندارو سارمہ غرانہ آریر

(ناگہاں مجھے باغ کی سیر کا خیال آیا اور مجھے مایون کی آواز (ایک مقامی پرندہ جو اپنی خوش آوازی کی وجہ سے مشہور ہے) سنائی دی جب دوست نے مجھے دیکھا تو مجھے ڈراؤنی صورت والا بھوت خیال کیا)

عام خیال یہ ہے کہ یہ زیرک کے محبوب تھے۔ مگر زیرک کی زبان دوست کی نشان دہی سے ہنوز سنگ ہو رہی تھی بہرحال حقیقتِ حال کچھ بھی ہو، اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نشۂ عشق ملنگ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

جوانو ژانی عشق کی نو ہو سے حکم وہابی
شیلمٹھ تن گزارا نو کویاں سے کیا حسابی

(وہ جوان جو عشق نہ رکھتا ہو۔ اس کے لیے وہابی کا حکم ہے (جس کا ملنگ سخت مخالف تھا) عشق کے بغیر زندگی کی کوئی حیثیت نہیں۔ زندگی اور زندہ رہنے کے لئے عشق ناگزیر ہے۔ جو عشق نہ رکھتا ہو وہ ہے اور اس کی کوئی قدر نہیں ہے)

ایران کے مشہور شاعر حضرت حافظ شیرازیؒ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

ہر آنکسی کہ دریں حلقہ نیست زندہ بعشق
براُو نمردہ بفتوئ من نماز کنید

(ہر وہ شخص جو اس حلقہ میں عشق سے زندہ نہیں ہے۔ جاؤ میرے فتوے پر اس کی نمازِ جنازہ ادا کرو۔ ہر چند کہ وہ ہنوز مرا نہیں ہے (زندہ ہے)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ تریرک کے کلام میں فلسفہ کی آمیزش بھی جا بجا موجود ہے اسی سلسلے میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

برہنہ ہوتم سوری نوہائ فلکو آدان
دیوس دیوث ننگ سرتیام بہ رینو وارغان

(فلک کا دامن مجھے پوری طرح ڈھانپ نہ سکا۔ اور یوں میں برہنہ ہو رہا۔ اس لئے میں نے بے وفا دُنیا کو مُردار کہا اور وہ بھی کُتے کا۔)

حدیث شریف میں آیا ہے۔

اَلدُنیا جِیفَۃٌ و طالِبُھَا کلاب

دُنیا کی مثال ایک مُردار کی سی ہے اور خالصتاً طالبِ دُنیا کی مثال کُتوں کی ہے۔

غالب نے اس خیال کو اس انداز میں پیش کیا ہے

ڈھانپا کفن نے داغِ معیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

یہاں غالب نے کفن کو داغِ معیوب برہنگی کا عیب ٹھہرایا ہے لیکن تریرک کے ہاں کفن بھی برہنگی دُور کرنے کی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ بھی دنیاوی چیز ہے۔

غمِ فراق اور عالمِ ہجر جو عشق و عاشقی کی اصل روح ہے اس کا اظہار مختلف شعراء نے مختلف انداز میں بیان کئے ہیں۔

ہر دی پھت بیکو یار مرنیکی لووان کو سوم دوم
اولوئے تہ پشیم مرثا نو یار بدیو کہا کی بوم

یہ شعر اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جس وقت ملنگ کو تحصیل بدر کیا گیا۔ ایک طرف غمِ دوراں نے وطن سے دُور رکھا تھا۔ تو دوسری طرف غمِ جاناں کے ہاتھوں ستم کشِ فراق تھا۔

غریب الدیاری میں جب وطن اور محبوب کی یاد ستاتی ہے تو غم غلط کرنے کے لئے

کوئی بھی رفیق موجود نہیں تھا۔ اور یوں دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے

دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں:

"اگر میں پرندہ ہوتا تو اُڑ کر طائرانہ دیدار سے بھی لطف اندوز ہوتا۔ لیکن افسوس ...... کہ

نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن"

اسی مضمون کو ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

راہی آر ییام اسے مہ جم روئے تاتین خدا یار

وُرزنین پیلیلو زائیلہ ہو تم اللہ تو مہ یار

(ترجمہ۔ ہنگام رخصت محبوب سے فرماتے ہیں کہ میں آپ سے جدا ہوا چاہتا ہوں۔ اور یہ

روانگی ایسی ہے جو شاعر کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس کی مثال اس چیونٹی سے دیتے ہیں

جس کے ابھی ابھی پَر نکلے ہوں۔ محاورہ ہے چیونٹی کے پَر نکلنے بُرے دن کا آنا مراد ہے

محبوب کو خدا حافظ کہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رخصت روانگی میری سیہ بختی کی نشان دہی

کرتی ہے اور اس سلسلے میں میں مجبور و بے بس ہوں۔ اور پھر اللہ سے مدد کی دعا مانگتے ہیں:

گل اعظم خان گل

گل اعظم خان گل بدخشاں کے ایک گاؤں دیخ کا ایک نوجوان تھا۔ چترال کی ایک حسینہ کو دل دے بیٹھا۔ عشق دیوانگی میں داخل ہوا۔ بات بڑھی۔ وہ غریب آدمی تھا اور اس کی محبوب کھاتے پیتے گھر سے تھی۔ جب اس سے جدائی برداشت نہ ہوئی تو اس نے معززین کے ذریعے شادی کا پیغام بھیجا۔ لیکن اس کے ماں باپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ اسی حالت میں شعر کہتا رہا۔ اور اپنے محبوب کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف میں رطب للسان رہا۔ ایک بار اس کی محبوبہ کپڑے دھو رہی تھی کہ پانی بند ہو گیا وہ اسی حالت میں باہر نکلی کہ پانی دیکھے کہ اس کا سامنا اعظم گل سے ہو گیا۔ وہ میلے کپڑوں اور ننگے پاؤں کو دیکھ کر چیخ اٹھا کہ اے لوگو! میرا محبوب پھول ہے اس سے مشقت کا کام نہ لو۔

وقت گزرتا رہا اور ایک بار اس نے پھر معززین کو رشتہ کے لئے بھیجا۔ مگر پھر انکار ہوا تو اس پر وہ سخت مایوس ہوا۔ مگر آتش عشق اور بھڑک اٹھی۔ اور ایک دن اس کی محبوبہ کسی دوسرے کی قسمت سے باندھ دی گئی۔ جب اس کا رشتہ طے ہو رہا تھا تو کئی لوگ امیدوار تھے۔ اس موقع پر اعظم گل نے کہا کہ امیدوار تم میرے محبوب کے جسم کی بہاروں کے طلبگار ہو

جو بالآخر خزاں رسیدہ ہوگا لیکن میری رُوح اس کے حقیقی حسن کی طلب گار ہے جو کبھی خزاں کے ہاتھوں تباہ نہیں ہو سکتا جب اس کی شادی ہوگئی تو اعظم خان مایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ یہ کہانی اس کے گیتوں سے سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔

اعظم خان کے گیتوں کا انتخاب درج ذیل ہے :۔

هر دیو جتن مه متہ پشارو گویان

چھیر ہستی چھوکی وطنی کسارو گویان

شیرین چھوڈ هینو دیارو گویان

(اے میرے دل کی ملکہ، میری آرزوؤں کی ملکہ۔ دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں دیکھوں گہری نظر سے دیکھوں۔ ایک پل بھی میری نظریں دوسری کسی چیز پہ نہ پڑیں۔ دل چاہتا ہے کہ اس دُنیا میں تم سے ہی ملوں تمہیں ہی دیکھوں۔ عمر بھر تم سے ہی میری ملاقات ہو۔ میرے ہاتھ تیرے نازک ہاتھوں میں ہوں ہم دونوں ایک ساتھ چلیں، ایک ساتھ قدم اُٹھائیں۔ ان خوب صورت بہاروں میں چلیں۔ تیرے گاؤں کے خوبصورت دلکش مقامات ہمارے پاؤں تلے ہوں۔ دُنیا والے لاکھ دشمنی کریں۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔ یہ ستمگر تم سے جدا کرنے کے لئے کوششیں کریں اور میری جان بھی قربان ہو)

اودمیرو بجنت تو آنگاہ نو بتی آسوس

آژی بریدکا پھت بے خیار بتی آسوس

بے سائرب قالبو صاجگار نو بتی آسوس

(میری سوئی ہوئی قسمت تو اُٹھ۔ ایک بار جاگ۔ آخر کب تک میں بھٹکتا رہوں اور بھٹکتے بھٹکتے مرجاؤں گا۔ جاگ تاکہ میری دنیا میں خوشی کی روشنی آئے اور مسکراؤں۔ کیا تم میری موت تک سوتی رہوگی۔ آخر تم کیوں خاموش ہو۔ اے میری سوئی ہوئی

قسمت آواز دے دنیا نے مجھے بہت دُکھ دیئے ہیں یہ بھی میری محبت کے دشمن ہیں۔ میں نے کونسا جرم کیا ہے محبت ہی تو کی۔ کیا محبت جرم ہے۔ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں میں اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔ اور میں ان سے اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو اُٹھ اے تقدیر رحم کر مجھ پر۔ دنیا والے رحم سے خالی ہیں میں قہقہے چاہتا ہوں۔ دُنیا نے مجھے آنسوؤں کا دریا دے دیا۔ میرے محبوب مجھ پر رحم کھا۔ اپنی آغوشِ محبت میں لے مجھے اپنے پیار کے دامن میں چھپا، اپنے پیار کی پناہ میں لے)

ہر دیو تیّن مہ خیال تہ سری شیرائے

لسّں کی ٹوٹہ نام دنیا خوشبو تمو نہ بیرائے

من نت لیعنی زمانہ سر دنے کی ہانے

(میرے ارمان بھرے دل کی ملکہ تم ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو۔ میرے خیالوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ میری رگ رگ میں ہو۔ دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ ساتھ ہو۔ میرا دل تیرے نام سے دھڑکتا ہے۔ تمہیں بھولے سے نہیں بھول سکتا۔ جدھر بھی نظر ڈالتا ہوں تم ہی تم ہو۔ جہاں میں جاتا ہوں وہاں تم آتی ہو۔ اور میں جب سوچتا ہوں تو تیری محبت مجھے ایک خواب نظر آتی ہے۔ آج مجھے زمانے بھر سے واسطہ ہے۔ مجھے دُکھوں کا بھی علم ہوا محبت میں کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ کوئی بھی میرے درد میں شریک نہیں ہوا بظاہر سب میرے دوست، حقیقت میں سب دشمن۔ زمانہ جب انسان کو ستانے آتا ہے تو عزیز بھی دشمن بن جاتے ہیں)

تن خوشو توان خطہ درے آدا بنو لسّم

ھروی بہپت کی ہوئے تطوڑاڑ یموچہ کہ ڈیم

(میں نے اپنے محبوب کی، اپنی جان سے پیارے کی میٹھی میٹھی باتیں گزری ہوئی یادیں شعر میں

لایا اور پھر اپنی باتیں بھی لکھ دیں، اپنی شکائتیں، اپنے گلے سب رقم کر دیئے۔ میں نے تیری تصویر سے باتیں کیں، اپنی نادانی پر ہنسا، اپنی دیوانگی پر رویا کہ ایک دریا بہہ نکلا۔

پو ہین لغا دا شتران بندہ دو چھاراہائے
خیالو سرا جسے مردو ستو غومنہ بیرائے

(میں ایک ایسی منزل سے گزر رہا ہوں جو محبت کی منزل ہے لیکن ایسی منزل جہاں تیری یادیں ہمسفر ہیں۔ میں نے تمہیں دیکھا۔ کائنات کے ذرّے ذرّے سے تمہاری تصویر جھانکنے لگی جیسے تم میرے سامنے ہو ہنستی مسکراتی ہوئی جیسے تم میری طرف آ رہی ہو قریب اور قریب۔ مگر وہ تو تمہاری تصویر تھی۔ تم جیسی، تمہاری طرح خوب صورت اور پھولوں سے زیادہ نازک، وہی دلفریب چہرہ، وہی شرمیلی نگاہیں۔ مگر نہیں، وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ ایک سراب تھا!)

تہ دون دلیومُت متہ شون دارو درمان
متہ چھر گوڈ دتین قلمدار و بو آرمان

(تیرے دانت دلی کے گوہر نایاب ہیں۔ پھول سے نرم نازک پنکھڑی جیسے ہونٹ میرے درد کی دوا ہیں یہ لب میرے لئے آبِ حیات ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ تجھے گلے لگاؤں دیوانہ وار چوموں۔ یہی مختصر آرزو اور تمنّائے دل ہے۔)

ایہئ باغہ بغت تے باغ جنّت فردوس
مایون چھوڈ نیان نسیں طوطی و طاؤس

(میں نے باغ دیکھا۔ ایک مقامِ محبت میں بیٹھے۔ یہ فردوس کے باغوں میں سے ایک تھا جہاں بہت سے پرندے چہچہا رہے تھے۔ بہت میٹھی اور پیاری آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ آپس میں کچھ کہہ رہی تھیں اپنی دلفریب میٹھی زبان

میں۔ اپنی دلکش سُریلی آواز میں۔ وہ آوازیں مجھے اب بھی میرے کانوں کو چھو رہی ہیں
اور میرے دل کو لبھا رہی ہیں)

مرزہ مہ دیناری مہ شان منہ سرا صدقہ

عاشق او شونی لیلے مجنوں، یوسف زلیخا

(تو میرا گوہر نایاب ہے میرے دل و جان تجھ پر قربان میری زندگی تمہاری
محبت کا نام ہے ۔ میں تیری زندگی کے ساتھ زندہ ہوں اور تیری خوشیوں کے لئے
مروں گا ۔ میں تمہیں تلاش کرتا رہوں گا اور تمہیں حاصل کرنے کی جستجو کروں گا ۔ جس طرح
لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا کی داستان کی طرح ۔ وہ بھی بچھڑے ۔ پھر ملے ۔ سچا ور ہوئے
آخر کار ایک دوسرے پر۔)

نو رو نہ قلم لیکھو خوردی نو بو یان

جنت تہ وطن تہ غونہ خوردی نو بو یان

(قسمت میری سو گئی ہیں اس کو بیدار نہیں کر سکتا۔ لکھے کو کون مٹا سکتا ہے فردوس
تیرا وطن ہے ۔ وہاں کوئی دوسری تم جیسی حور نہیں رہ سکتی ۔ وہ تیرا مقام حسن ہے ۔ وہ
خوب صورت ہے تیرے لئے اور تم حسین ہو ۔ ان حسین نظاروں کے لئے۔)

رو نہ آز لہ نو یشتہ اور بیرد نصیب

عاشق معشوقاں وفا کورانی مناسب

(یہ تقدیر کا کھیل ہے قسمت کی لکھی ہے میری تقدیر سو چکی ہے ۔ وہ بد نصیبی
کی سیاہی سے لکھی گئی ہے ۔ کاش حسن و عشق میں وفاؤں کا مقام ہوتا ۔ محبت میں
انصاف ہوتا ۔ نہ ماننے والے محبت کو قدر کی نظر سے دیکھتے ۔)

کڑو مان نیسکہ آمان ما پہ شنڈہ سرحدی

سگنی قلم بتان خزینہ مہ ہر دی

(آمان شاعر نے اپنے محبوب کی تعریف کی ہے۔ مگر وہ گنوار عاشق ہے۔ مگر میری محبوبہ جس کی تعریف لفظوں سے نہیں کی جا سکتی۔ میری زبان میرا قلم ہے جو کبھی تھکتا نہیں۔ دل میں اس کے حسن کی تعریف کا ایک خزینہ ہے ختم نہ ہونے والا۔ رگ رگ میں تیری محبت ہے۔ ہر دھڑکن کے ساتھ تیرا نام ہے۔)

نن یو ٹیکہ کھوروڑا شپھنیبر وچہ چھروڑ

ایفو ارمانہ ثان برارگینیاں اپا موم روڑ

(حسن جو کہ آپ تمہارے سامنے کھلی ہوئی ایک کلی ہے۔ ایک غنچہ ہے۔ سرخ مانند پھول۔ وہ کونپل تھی۔ آج غنچہ ہے کل چٹک کر مہک جائے گا اور پرسوں خزاں کے بے رحم پنجوں میں وہ مرجھا جائے گی۔ مہک اڑ جائے گی خوشبو خزاں کے بے رحم جھونکوں کے ہمراہ اڑ جائے گی پتے بکھر جائیں گے۔ بکھر کر خاک میں مل جائیں گے پھر تمہارا یہ حسد کیوں۔ وہ تو ایک ہی پھول ہے فانی۔ وہ ایک ہی غنچہ ہے مختصر عمر کا یہ دشمنی کیوں؟ حسن تو لافانی ہے۔ فانی کے لئے لازوال جذبہ ہر ایک کے دل میں نہیں ہو سکتا۔ یہ زیادتی کیوں۔ ایک دوسرے کے خون پینے کے درپے ہونے والو یہ ظلم ہے۔ وہ تو دو دن کا فانی حسن ہے۔ تمہاری جوانی بھی مختصر مجھے نہ چھیڑو۔ میرے عزیزو میں اس فانی حسن کے لئے نہیں عشق کی لافانی آگ میں جل رہا ہوں)

مہ نام گل اعظم خان۔ نکی تہ گدیر یو مکان

ہردی چھڑو کی محکم یتی شیر نیز یک بے امکان

(میرا نام ہی تو گل اعظم خان ہے۔ درست ہے کہ زمانہ والے مجھے غریب کہتے ہیں میرا تو

مکان ہی نہیں۔ وہ مجھ سے حویلی اور باغ مانگتے ہیں۔ میں جہاں شام ہو وہاں سوتا ہوں ہوں۔ مجھے اونچی حویلی سے سروکار نہیں۔ مجھے باغوں کی آرزو نہیں میں جس گلی کو چاہتا ہوں وہ تو ہے۔ اس چاہ کو کوئی بھی میرے دل سے نکال نہیں سکتا۔ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں وہ ایک تناور درخت ہے۔ اگر کوئی محبت کو میرے دل سے نکالنے کی کوشش کرے تو اس کے لئے یہ ممکن نہیں۔ تم ہزار کوشش کرو مگر بے سود ہوگی۔)

ملک انگریز ہیر دمہ جم روئے تو کیانی بوس

جو انو کمد سیتو پشاو بویان شیر تہ موش

(اس ملک پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ اس سرزمین کو انہوں نے اپنی جاگیر بنایا۔ کاش میں انگریزوں کو تمہارے ملک میں آنے سے روک سکتا۔ یہ تمہارا وطن ہے۔ یہاں تیرے حسن کا چرچا ہے اس وطن پہ تیرے حسن کا راج ہے۔ مگر میں کمزور ہوں، بے بس ہوں۔ کچھ نہیں کرسکتا۔ تیرے رشتہ داروں نے مجھے غیر سمجھ کر تمہیں دوسرے شخص کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ میری غریبی اور بے چارگی دیکھ کر مجھے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ گدا کہتے ہیں۔ بے وطن کا لقب دیتے ہیں)

ژدیو ٹیکھن کوسے ہوستان میجہ دیاؤ ہے

اللہ قدرت ثانو یار مہ سارہ مو پیشے

(محبوبہ کی شادی ہونے کے بعد وہ اپنی حویلی میں تھی اور شاعر کی نظر اس پہ پڑتی ہے اور کہتا ہے میری تمنا تو ہوئے آپ کے ساتھ ساتھ چل۔ ایک ادا سے چل۔ کمر پہ ہاتھ دونوں رکھ کر چل۔ ناز و ادا سے مسکراتی چل۔ میری دلبر یہ نوشتہ تقدیر ہے۔ گلہ نہ کر۔ الزام جدائی کا نہ دینا یہ تقدیر کا تماشہ تھا کہ مجھے تم سے پیار تھا میں دل وجان سے تیرا طلب گار تھا۔)

حشش نو آرتیام تن ڈقیو حنے پشمان

ہموشس باؤ مہ تسیکو گونیان زمانو غم

(زندگی ایک انمول جوہر تھی مگر میں اسے سمجھ نہیں سکا۔ درد الفت کی شکل میں مجھے آ دبوچ۔ آیئں مجھے زمانہ نے ٹھوکروں سے میرا استقبال کیا۔ دکھوں سے آشنا کر دیا۔ میں نے آہ بھرنا سیکھا۔ تڑپنے کا مزہ دیکھا۔ سسکنے کی پہچان کی۔ غم زمانہ پایا۔ درد جاناں کا ذائقہ چکھا۔ زندگی کو نہ پہچان سکا۔)

ادا اصلاد یخیک اصل یشینہ نیشم

سلام پیچم چھک دو یو تین کاغذ نو یشم

(میں وینخ کا باشندہ ہوں یعنی بدخشی ہوں۔ آپ لوگوں کا مجھ سے تعصب ہے کہ میں دور کا ہوں دوست۔ تمہارے وطن کا نہیں صحیح۔ تم سے دور جاؤں گا۔ یشن جاؤں گا جو راجاؤں کا دیس ہے حسینوں کی وادی ہے۔ دل والوں کا شہر ہے۔ وہاں نفرت نہیں محبت ہے۔ وہاں بیگانے اور یگانے یکساں ہیں۔ وہاں سے بھی تمہیں میرے دل کی آواز سنائی دیتی رہے گی۔ میں کسی کو سلام بھیج دوں گا۔ میرے خط کا نام سلام ہوگا وہ صرف سلام لے کر محبوب کو مل جائے گا وہی میرے دل کی باتیں ہوں گے وہی میرا پیغام محبت ہوگی وہی میری تمنائیں۔)

سیدورغ

صدیاں پہلے چترال کی ایک پہاڑی کے دامن میں ایک مضبوط قلعہ تھا جس کی دیواروں کے ساتھ دریائے مستوج بہتا تھا۔ قلعہ کے قریب ہی دریائے مستوج میں نوجوان تیراکی کرتے تھے۔

اسی گاؤں میں صفدار اور سیدہ کا رومان پروان چڑھا۔ صفدار اور سیدہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ دونوں کا بچپن ایک ساتھ بکریاں چراتے چراتے جوانی کی حدوں میں داخل ہو گیا اور بچپن کی قربت محبت میں بدل گئی۔ دونوں کا ملنا جلنا آزادانہ نہ رہا۔ مگر چوری چھپے کی ملاقاتوں کی خوشبو پھیلی اور صفدار اور سیدہ کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا۔

جب بات آگے بڑھنے لگی تو سیدہ کے والدین نے اس کی شادی گاؤں کے ایک نوجوان عصمت سے کردی اور یوں صفدار اور سیدہ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

عصمت کو شک تھا کہ سیدہ شادی کے بعد بھی صفدار کو نہیں بھُولی۔ چنانچہ اس شک کو اس وقت تقویت نصیب ہوئی جب ایک روز تیراکی کے مقابلے سے واپس آیا تو کسی نے اُس سے کہا کہ سیدہ قلعہ کی دیوار سے چھپ چھپ کر صفدار کی تیراکی دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ غصّے میں آکر عصمت نے صفدار کو قتل کر وا کر مستوج دریا میں پھینک دیا۔

صفدار کی موت سیدہ پر بجلی بن کر گری اور گیت "سیلدو نغ" سیدہ کی اسی نالہ و شیون پر مبنی ہے۔

وہ کہتی ہے:۔

عاشق تو تان بیتی لہ مہ ژ انئے
ے
بنام مہ کو کو سان لہ او لادئے

آتشِ خاموش تو پہلے ہی تمہارے دل سے بھڑکی تھی۔ آج تم نے مجھے موردِ الزام ٹھہرایا۔
اس وقت سیدہ کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔ بے اختیار بول اٹھتی ہے۔

چوڑاؤ چو ئنجو تے یگئے لہ مہ ژ انئے
ے
اُوغو پھینان شوپے لہ او لادئے

صفدار جیسے مشہور تیراک کا دریائے مستوج میں ڈوب کر مرجانا یقیناً معنی خیز تھا۔
صفدار کا گھر چوئنج نامی گاؤں میں واقع تھا۔ شعر کا مطلب یوں ہے۔ تم اپنے گاؤں "چوئنج" میں چہل قدمی کرو تو بلبل کی طرح چہچہاتے پھرو۔ اور جب تیراکی کا مقابلہ کرو تو "پانی کے بلبلے چُن" پانی کے بلبلے چُننا کھوار روزمرہ "اُوغو پھینان شوپے" کا لفظی ترجمہ ہے جس کا مطلب تیراکی میں مہارت دکھانا ہے۔

سیدہ اپنے ارمانوں اور تمناؤں کو دردناک لے میں گا رہی ہے۔

ے اوہ تن ژھیکو نیچے کیہ مہ ژ انئے
چھنی ثاوک کو روم لہ مہ ژ انئے

میں اپنے دلبر کے لئے بکری کا بچہ (بزغالہ) مستعار لے لوں تاکہ میں

چھانیو دریل کو شیم لہ مہ ژ انئے
ے
مہ ژھیک اد سناؤ کیبر لہ مہ ژانئے

بکری کے بچے کو ذبح کر کے تیراکی کا مشک بناؤں تاکہ میرا دلبر مشک باندھ کر تیراکی کا مقابلہ کرے گا۔

دربلوہی جام پھوورے لہ مہ ثرانئے
ے
اوسانو جام لوڑے لہ سیدئے

اپنی مشک کو خوب ہوا سے بھر دو۔ اور ہوا کے رُخ کا بھی خیال رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ دریا میں ڈوب جاؤ۔

زَری بٹس کورے لہ مہ ثرانئے
ے
موراڑی نام تکھوم لہ مہ ثرانئے

دریا کی موجوں کو چیر کر آگے بڑھو، میں اپنی اس موسیقی کو "موراڑی" بنالوں۔ موراڑی پُرانے زمانے کے ایک دردناک مرثیے کا ساز ہے۔

تہ دُور چُوئنجا شیر لہ مہ ثرانئے
ے
مہ دُور ہنیجا شیر لہ مہ ثرانئے

تمہارا گھر "چُوئنج" نامی گاؤں میں واقع ہے۔ میرا گھر "ہُنجا" گاؤں میں ہے۔ جہاں سے تمہارے گاؤں کا نظارہ باسانی کیا جاسکتا ہے۔

سیدبوڈق جوان لہ مہ ثرانئے
ے
صبنوھوسٹس نوکوئے لہ مہ ثرانئے

سیدہ ایک الہڑ دوشیزہ ہے، اور عشق کے میدان میں ناتجربہ کار۔ یہ مرثیہ صفدار کی موت پر سیدہ آہِ سرد کے ساتھ نہایت دردانگیز لے میں گا رہی تھی جس کو عصمت کے حکم سے بیابانی قاتلوں نے دریائے مستوج میں تیرتے ہوئے قتل کر ڈالا تھا۔

خدا رحمتو کرد و م

خدا رحمت چترال سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک دوشیزہ سے جنون کی حد تک پیار کرتا تھا۔ اتفاق سے حاکم چترال نے کسی جرم کی پاداش میں خدا رحمت کو نظر بندی کی سزا دی اور قلعہ بلیچ میں بند کر دیا۔ خدا رحمت کو قید ہونے کا غم نہیں تھا۔ اسے دکھ تھا تو یہ کہ اس کا محبوب چترال میں ہے اور وہ سینکڑوں میل دور بند ہے۔ خدا رحمت کو بعد ازاں دونی کی چراگاہ میں بھیج دیا گیا۔ جب اس سے بکریاں چرانے کی مشقت لی جانے لگی اور آخر میں اسے چترال سے ۷۰ میل دور مستوج کے علاقے میں قید میں ڈال دیا گیا۔

خدا رحمت کی کہانی یا گیتوں سے اس کے قید و بندی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے بعض اشعار سے یعنی شہباز کا بار بار استعمال اس کی بہادری اور حکمران سے اختلاف کی طرف اشارے کرتا ہے۔

بہر طور یوں لگتا ہے جیسے خدا رحمت اس قید و بند کے دوران ہی جاں بحق ہو گیا۔ اس سے زیادہ گیتوں کے حوالے سے کوئی سراغ نہیں ملتا۔

بیتاہ متے قہرین مرحبت چھترارنئے داڑئے اسور

غیری گوم تندریان نگہبان تلّچہ مہ بلئے اسور

(حکمرانِ وقت کا زیرِ عتاب ہوں مجھے چترال جیسے خوب صورت وادی سے نکال کر یہاں قید کر دیا ہے بس تجھ پہ قربان جاؤں۔ صرف زندگی دینے والا نے تجھے بلچ کے قریئے میں زندہ رکھا ہے)

ناشکمہ بنی آدم شکر نوارتیم تن چھترار وشم

متبار دور وگنی مہ بلہہ درنیائے سٹہ شوتار وشم

(کاش میں اپنے محبوب کی گلی میں رہتے ہوئے خدا کا شکر بجا لاتا۔ یہ صرف میری ناشکری کی پاداش ہے کہ مجھے ریتیلے بیابان میں قید کر دیا گیا۔ اور مجھے خانہ بدوش کر دیا گیا)

بلچ دو دوران ماڑذق دو دوران مڑاقوش کوری اسوم

چھترارچوڑانان ژاغہ مرتن توبویان رے ہوش کو ری اسوم

(بلچ کا قلعہ جہاں مجھے قیدی بنایا گیا ہے اس وقت حشرات الارض کا مسکن ہے۔ اور اس کی نسبت چترال حوروں کا مسکن ہے۔ شاید کہ وہ میرے رہنے کے لائق نہ تھا۔)

کھنجوڑکیپلی ثان یہ زندان خانہ ئی کیچہ ہیرو ہوئے

اِی دِی مہ تے چوڑے نہ گدیریو ہردی پوتوئے پھیرو ہوئے

(میری سیاہ زلفوں والی کوئی قید خانے یا قفس میں رہنے کی کس طرح عادی ہو گئی۔ تیرے مجنوں کا دل جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔ خدارا ایک بار پھر نغمہ سرا ہو۔)

رویان کو کیہ خیال یہ گدیری ختیق ڈق کوڑویران رے

ملکوغزینہ رئے ہوش کوئے یہ گدیریو ہردی پوئیران رے

(میری توجہ خوانی کے متعلق لوگوں کو ہزاروں وہم ہوں گے۔ میرے دل میں آتشِ عشق کا احساس صرف اور صرف میرے محبوب سے ہے)

آرمان مسمتے تہ ان ڈوم کتان موڑ ینین چھیر گوڑا تمیر
نصیبو چہ مہ بخت بمابرہ کہ تو ہوئے بے مقصد چھریر

(اے کاش! کہ میں ماہتاب ہوتا۔ میری کرنیں درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے میرے محبوب کے گورے گالوں پہ پڑتیں۔ اسی طرح اگر میرا ستارہ گردش میں رہا تو محبوب کے ملنے سے پہلے میں خاک میں مل جاؤں گا)

دونی کی چراگاہ میں

دو نیہ آسوم غری ہائے تہ ان نہ یور و پوشیتم نہ مسو
وطن دو دیری ہوئے پوشین نو بوبا ن ترا نو نسو

(میں دونی کی چراگاہ میں بکریاں چرا رہا ہوں شمس و قمر کی تابندگیوں سے محروم ہوں۔ وطن سے بہت دور نکل گیا۔ اب میرے لئے محبوب کا دیدار محال ہے۔)

وطنو سختہ گگ ہائے تہ ان اڑ ی تہ حکمانتے مہ قبول
مریمیان مہ مرور مریکو تراغہ مہ نخو شو دور

(میرے دل کی سلطنت میں تو پھول کی شہزادی ہے اور میں ہر وقت تیرا غلام۔ اگر میں مجرم ہوں تو قربان گاہ میرے محبوب کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔)

ڈاقو تیغوں سابو رج اُو لوئے بنای جنگو موشرین
مہ ژان نیشی اسور قلا ہور پو لوغ موٹا گرنہ ین

(میرا سفید رنگ کا شہبازہ گھنے جنگل سے ہوا پرواز کرگیا۔ میرے محبوب اب گلابوں

کے چمن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس چمن کے گرداگرد دوبان کے باڑے ہیں۔)

ڈاتو تیغون سایورج ایکم پاد بند لعل جنولی

ڈاقو تے ژونو بریک مہ تیغون کا نماستے بولی ؎

(میرا سفید رنگ کا شہباز جس کے پاد بند (پاؤں پہ باندھنے کے تسمے) ریشم کے بنے ہوئے ہیں اور گلے کا ہار لعل و جواہر کا ہے۔ اس سے یہ بہتر ہوتا کہ مجھے زندہ درگور کرتے اور میری نظروں کے سامنے میرے شہباز کو کوؤں کا شکار نہ بناتے۔

ڈاقو تیغون سایورج ہائے ثان دوردیتی ٹانگ کرنے سیر

اوہ سوستہ چھیک خوشوشٹکی ثان کرنیسے سیر ؎

(میرے سفید رنگ کا شہباز کاش پرواز کر کے بلندیوں میں نکل جائے۔ اب تو میں بسترِ مرگ پر ہوں۔ کاش میری موت میرے محبوب کے پاؤں پر سر رکھ کر واقع ہو)

پایکی خوباناں سوتو آسمانا ری یو خومیت

عرضی منظور نو ہوئے کونسلو کا تمذ مہ ستم توریت ؎

(جب میری درخواست کے مسترد ہونے کی خبر کونسل سے مجھے ملی تھی اسی وقت ظالم حوریں فلک ہفتم سے زمین پر اُتر آئیں۔

وطن مہ تن ارمان یہ خبریا گوم رے کیہ گماں

کوسوم کہ عشق او شوئی ھے لوئی ہوٹش کوی معشوقاں ؎

(یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرا بسیرا ان پہاڑوں میں ہوگا۔ عشق کے رموز سے صرف وہ لوگ واقف ہو سکتے ہیں جن کے دل سے عشق کی چنگاری اُٹھی ہو)

ضمیمہ

ڈوک یخدیز

کھوار	اُردو
لال	معزز، میاں
کلئے	خاتون، بیوی
سوملک	سابق دور کا سب سے پہلا "کھو" حکمران
دراسن	چترال کا ایک تاریخی مقام
تورکھو	پیٹی وخان سے ملا ہوا چترال کا ایک اہم حصہ۔
کھوت آن	چترال کے علاقہ "یارخون" اور تورکھو کے درمیان ایک مشہور درّہ
یارخون	مستوج سے بروغل کے دربند تک دریائے چترال کے دونوں طرف پھیلی ہوئی ایک وادی
مستوج	چترال کے اہم ترین تاریخی مقام
ساہون	سامان باندھنا۔ تیاری

کھوار	اُردو
گرُوم	چاہت
دریغ	جنگلی درندے
داغا	ارمان میں
ژوچھو	سوکھ کر کانٹا ہونا
بغت	چلا
کیٹریم	آنسو بہاؤں
بریکو	مرنے کو
بیزبارودت	عقاب کو
کیرکوٹ بابہ	چرمی پاپوش پہننے والے
موش	مرد، شوہر
چھوئی انوس	رات دن
استور	گھوڑا
ڈوک شوڑو	نیستان کو
یخدیز ڈوک	تورکھو کے ایک قریئے کا بنجر ڈھلوان حصہ

نان دوشی

کھوار	اردو
دہلیز	دہلیز
بائی پٹس	چترال میں قدیم طرزِ تعمیر کا ایک مخصوص مکان
گوریج	سٹور روم۔ توشہ خانہ
کرسینس	مول لینا
ژورے!	بیٹی!
یورئے	آفتاب!
دوشی	اصل نام
گرہ	سقفی روشندان
توریست	پہنچے
کھرغیر	کیاری
بریشٹ	ایک خودرو پہاڑی پھول دوشی کا سہیلی کا نام
چوغین	بید کی شاخوں کا

کھوار	اردو
اشپیری	پنیر
ژاک ددبو	شادی بیاہ کے موقع پر بلائے جانے والے رشتہ دار
سُربند	سَربند
چاقو ہنو	کور چاقو
اَخلی ہنو	کور کنگھی
شُوغوتو	بے نگینہ انگوٹھی
ٹُمنگشتو	انگوٹھی
بنگڑے	چوڑیاں
پچھویز	کنگن
تکتو دیتی	چھلّے کڑے۔ یعنی نہ چاندی کے بنے ہوئے تکمے جو دلہن کے زیورات میں مخصوص ہوتی ہے۔
چیغیچی	دلہن کو دیئے جانے والے تحفے تحائف۔

لوک ژور

کھوار	علاقائی زبان

کھوار	اُردو
پُتَنَخ	لکڑی کے بنے ہوئے خرادی ڈونگے
کیپینی	لکڑی کے چمچ
جَہَرکہ	محفل
نان	والدہ
شیرین نان	پیاری امّی
لونخوش اسپو سار	بہت ہی اچھی باجی
راغشٹی	علی الصبح
اَنگہیتو	جگایا
اوراژو	نیند
ٹیبوک	دُلہا/دُلہن
ژیریپ	براتیوں کے ساتھ بڑا سمدھی
پرچم	زُلف
پرچیان	زلفوں
پُرُوشٹ	استقبالی
ژیر	قطار
موشو	خاوند کے
ہوستو	ہاتھ کو
قلفین	مقفّل

کھوار	اُردو
پلیلی	ننھّی/چیونٹی
پھیک پھیک	چُپ چُپ، نہ رونا
گوڑدتے	صدقے جان
ژاوسان	خوشی سے جلتے ہو
خدائی تہ یار	اللہ تیرا بیلی
چھوئے بچھوئے	راتوں رات
سامونان	سامان باندھنا
سنگ تاب	تپتا ہوا پتھر
کیچہ	کیسے
کھوران	قرار پاتا ہے/سنبھل جاتا ہے
موژدہ	گاؤں کا وسطی حصہ
موژین	درمیان سے
ٹیوران	دلربا منظر پیش کرتا ہے۔
برار	بھائی
پورینگ	دلہن کے ساتھ جانے والا رشتہ دار
ہوستنیرٹی	دہ سسرال کے محافظ بن
ترانگوؤ	گرفت سخت رکھ

سیدوغ

کھوار	اردو
مہ ژہ اشئے	پیارے
بُنیام	انگشت نمائی کرنا / بدنام
اولادیمے	قومیت کے رشتہ دار
چوڑاوُ	نغمہ سرائے کرتے ہوئے
گیئے لہ	آجائیے
اوغو پھنیان	پانی کے بلبلوں کو
ثوپے	چن لے
تن ژھیکو	اپنے جان جانان کو
چھنی	"نزغلہ" لیلا
ژاوک	مستعار
دربل	مشک
اوسناوُ	تیرتے ہوئے
پھوئے	ہوا بھر دو
ژری	موج دریا / نر
بٹس	بخرے / حصے
موراڑی	کھوار موسیقی کا ایک مخصوص دھن

نانوژان

کھوار	اردو
دشمنے	ایک قبیلے کا نام
داربوئے	رضاعی بیٹا
ہرچین	لاسپور کا ایک تاریخی مقام
پیژمیک	والدین کو سپرد کرنا
گھنہ غار	زیورات کے لئے رضاعی ماں کو دی جانے والی رقم یا اراضی
شیکودرالی	رضاعی ماں کو خصوصی تحفہ
درالی	دودھ پلائی کا عوض
بیرژیس راپھینی / ڈوک راپھینی	شیر رضاعت کے عوض دی جانے والی جاگیر کے الگ الگ عرفی نام
ویرشگوم	گلگت کا ایک حصہ
غژنیک	سیر و سیاحت / دورے پر جانا۔

کھوار	اردو	کھوار	اردو
جنالی	پولو کا میدان / جولانی	پوشاؤ	دیکھنے
چلہ خانہ	خانقاہ / ریاضت کی جگہ	نوژان	انجان / بیگانے
دول	ڈھول / طبل	الگ	چاہنے والے
دمامہ	نقارہ	ژاؤ	بیٹا
سرنائے	نے / شہنائی / نرکل	شخطی غاڑہ	شرطیہ پولو
تماڑوار	پولو کا مخصوص دھن	بول	قافلہ، فوج
قلنگ	ٹیکس	جم موشیو	نیک نامی و بہادری کے
تھنگی	ششک	چتیرو	خیمہ کو
چلیکی / تور	سایہ دار درخت	لسٹ گاتہ	ہموار گھاس
روِن	روبینہ کا درخت	دوری	مہک، خوشبو
یتریک	سپیدہ	غیر دوم	پرواز کروں
پٹرنج	چوگان کا بال	نسین	آس پاس
تانگ ژوئے	پہاڑی والا سوتا نہر	پولیم	جل جاؤں
ڈانزران دیہہ	محلے کا نام		

ہاشم بیگم

کھوار	اردو	کھوار	اردو
کالکوران	فاختاؤں کا		
میر ژوری	نیلم پری	چھیر تت	رضاعی باپ
نوراوگونی	تکنے / مشاہدہ کرنے آئیں گی۔	چھیر نن	رضاعی والدہ
ثانگ	پہچان والے	خونزہ	ملکہ

شودونگ/ڈوک جوُر

کھوار	اُردو
یورکیچ دویو	باز پکڑنے والا
یورکیچ	باز پکڑنے کا مکان
کماڑ	چمنی/روشندان
گوشینی	تراشی ہوئی پتلی لکڑی
شُونج دار	باریک لکڑی
باشش	انعام
دستوری	رواج کے تحت سالانہ ملنے والی اشیاء
میرشکار	میرشکار
دست موزہ	دستانے
ٹک	ٹانکہ لگانا
جغوئی	باز کے گلے کا ہار
کھوئے	ٹوپی
ڈوک جوُر	ایک ہی دھن پہ پہاڑی میں موجود بہت سے باز پکڑنے والوں کا ایک ساتھ گانا۔

کھوار	اُردو
شودونگ	اپنے باز کی تعریف میں لمبی لے میں باز پکڑنے والے کا گانا۔
بازین ہیردغون	چوڑے سینے والا
سایورج	شہباز
ٹرانگ	اونچا
بوڑیو چخنہ	برچی کی شاخ پر
ماڑ	آشیانہ
دلاغیلو	علی الصبح/صبحدم
گل چینہ	بدخشاں کا ایک علاقہ
گوڑوتے	گلے کا کیا کہنا
دینار	نایاب لمبی گردن والا جسیم باز
غاندیگر	عصر کے وقت
چھمقار	شمقار/سیاہ چشم نسل کے باز
زوموگھٹاریا	پہاڑی کا کٹھن مقام
بجگی سایورج	نوعمر شہباز
پولاد	فولاد

کھوار	اُردو
چھلکین	بڑے مضبوط
تف	پنجے
ولیسی	انتظار میں
غئیاری	غیب سے
کیسرنزی	بوڑھا باز
کوڑو یورج	زرد چشم باز (نر)
بہری	سیاہ چشم نسل کے باز
چرخ	″
سندان	″
قبری	″
درو متائے	″
بوورج	″
بسرہ	″
چھپ	″
"شمقار ای اشکار"	ساری عمر میں شمقار کا ایک شکار

بیگال

کھوار	اُردو
"یورس بیگم"	گذرے وقتوں کی ایک حسینہ کا نام

کھوار	اُردو
دانیال بیگ	انیسویں صدی کے ایک مایہ ناز شمشیر زن جنہوں نے فرنگیوں کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی"
جنالی	پولو کا میدان
پنھک	سرحدی علاقوں میں جشنِ نوروز کا علاقائی نام
دیرو جنالی	ایک خاص قریے سے ملحقہ پولو کا میدان
میتار	حکمران / مہتر
مت بیگم	اپنے وقت کی ایک حسینہ کا نام
چھوٹو	رات کو
مری	قتل کر کے
بوغدو	نکل گئے
پزو	سینے پر
ژندری	ہنہنا کے
چاغیز	چابک
ژنگی	ہلتے ہوئے
غاڑو	چوگان کھیلنے

کھوار	اُردو
وارزہ	بھرے پر
پونگا	شروع میں
ہاٹ	گول/سکور
طمپوق	ہوا میں اچھال کر گیند کو مارنا
پھوریمن	ہواؤں میں
چھوئیمن	انتہائی بلندیوں میں
پوتریک	ترتیب دینا
پھتوکی	کمی
پٹرینجو	گیند
داؤ	بوڑھیا
مُتچمہ	موتی کا بنا ہوا ایک مخصوص زیور
تارسمہ	زرین دِبستی
پروشٹ	استقبال کو
چسرت	حسین

رُستم خان رُستم

کھوار	اُردو
اِسپج	یارخون کے ایک قریئے کا نام

کھوار	اُردو
زیرک	ہوشیار/ایک شاعر کا تخلص
دَنی	کھوار موسیقی کا ایک دُھن
بریپ	یارخون کا ایک قریہ
وشکیار	کی طرف سے
اُوشک	ٹھنڈی
گان	ہوا
تھان	برداشت کرنا/تن
مَوژتو	بیچ میں
کھارخ	دیوار/حائل/رکاوٹ
ویشٹنیان	رخصت کرتے ہیں
بلور	بلور
اُشرو	آنسو
ڈیل دیاؤ	لڑھکتے ہوئے
موخو	چہرے پہ
لئے آشرو	خون کے آنسو
خپ	ایک نظر
چینیہ	پیالی میں
پیک	نوش کرنا
گدیریو	دیکھنے کو

کھوار	اُردو
لڑینگور	ہلے گا
تھیک	قرار پانا
کانو	درخت کا
کمبوخ	شاخ
تیتان	اُنہیں
بخت پونُوئیرو	بدنصیب
جلاد واڈ	مکار بوڑھیا
غش	ڈانٹنا
ثانگ تھینو	سرو قد کو/ بلند قامت
کوٹھو	محبوبہ کی قیام گاہ کا نام
ہون	سیلاب
پھت بسو	نصف دن/ آدھ روزہ
نرچ	نرچہ
نارُو	بوڑھا
حماتو تین	برج حمل کو
حالوتین	حالت کو

شیر ملک کدیری لال

کھوار	اُردو
فرنگی دوہو	چترال پر فرنگیوں کے
	حملے کے دوران یعنی
	۹۵ — ۱۸۹۴ ء
وے ایوا کو	بے جڑ
اُمبول	اُمبروال
مُبلس	مجلس
دارڑ ئینیان	نکال باہر کرتے ہیں
چوڑ سینو	حیات
شوترینیں	دھاگوں سے
شنگ	خطرہ
چھوتیو سوم گوسون	خس وخاشاک
چھیور	ٹوٹے گا
جوست	دو تلوار ایک میان میں
کھونگورینو نو بیر	نہیں سما سکتے
ہردی چھو میکار	بے تابی دل سے
ثان ٹوپو بیر	ترس آنا
زوم اُو لو یُر	پہاڑوں کا گرنا
ہرین	آئینہ
لوڑاوا	دیکھتے ہوئے
اِی شور بار	صدبار

کھوار	اردو	کھوار	اردو
شونج	سوئی	اُچھو	اِسٹبری
سوموچہ شتر کوروم	بخیے ٹانکتا جاؤں اور دھاگے بناتا جاؤں	شینیٹیف	ادنیٰ نسل کا ایک باز جو دوسرے پرندوں کا شکار نہیں کر سکتا
ودر	معطر	فلکو آدان	فلک کا دامن
چھور	چار / آنکھیں چار ہونا	ریتیو درغان	کمتر چیز مردار
زور	ستم	ہردی بھت	ستم کش فراق / اداس
زرنگ	چونکا دینا	ورزنیں پلیلیو	پروں والی چیونٹی کے
بیھتیائی	جاگ اٹھا / ٹھہرا		
گرٹپویومون	گرما و سرما		
تھورونان سُم	تھورنی (کانٹے دار پھول)		

زیارت خان گدبری زیرک — ٹہ پھوری

کھوار	اردو	کھوار	اردو
سنوغر	زیارت خان ملنگ کا آبائی گاؤں	اِستری	تارے
قوم	قبیلہ	مسو	چاند کے
ژوندرے	قبیلہ ژوند کی ایک شاخ	ٹشداریک	ملازمین
ژدیو	ہنرمیں	متیاریک	راجپوت
		دِلیش	ناراض
		کاریں	کنایۃً / اشارۃً

The folk tales of Chitral give us an insight into the nature and psyche of simple and loving people of this region. Chitral valley is surrounded by snowclad, magnificent and awe-inspiring mountains. Accessibility depends on changing moods of weather.

The age-old customs and traditions of this land open a window into the beauty and the happiness of these brave people who have made the lap of nature their home. The soil of this land is yet undisturbed by the pollution of modernity. It is as pure and invigorating as a whiff of fresh air.

The stories included in this book are a valuable source of information for the researchers and students of folk culture and traditions of this mountainous region of Pakistan.